اردو میں غزل مسلسل
روایت اور فن

مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

۲۰۰۳ء

مقالہ نگار

محمد جعفر

ایم۔اے (عثمانیہ)' ایم۔فل (حیدرآباد)

نگران

ڈاکٹر میر محبوب حسین

ایم ایل آئی سی (مدراس)' ایم۔فل پولیٹیکل سائنس (عثمانیہ)'

پی ایچ۔ڈی [اردو] (حیدرآباد)'

ریڈر' شعبہ اردو' یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

شعبہ اردو' اسکول آف ہیومانیٹیز' یونیورسٹی آف حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

فہرست

- ابتدائیہ ______ 4
- باب: ایک — غزل: پس منظر اور منظر ______ 12
- باب: دو — غزلِ مسلسل، ہیئت اور ٹکنک ______ 24
- باب: تین — غزلِ مسلسل دکن میں ______ 42

(الف) غزلِ مسلسل دبستانِ گولکنڈہ میں ______ 43

● محمد قلی قطب شاہ ● سلطان عبداللہ قطب شاہ ● ملا غواصی

(ب) غزلِ مسلسل دبستانِ بیجاپور میں ______ 62

● علی عادل شاہ شاہی ● سید میراں ہاشمی ● معظم بیجاپوری ● حسن شوقی

(ج) غزلِ مسلسل دبستانِ اورنگ آباد میں ______ 82

● ولی اورنگ آبادی ● سراج اورنگ آبادی ● داؤد اورنگ آبادی

- باب: چار — غزلِ مسلسل شمالی ہند میں ______ 94

(الف) غزلِ مسلسل عہدِ میر میں ______ 95

● میر تقی میر ● خواجہ میر درد

(ب) غزلِ مسلسل: ناسخ (لکھنوی)، غالب (دہلوی) اور

ان کے ہم عصر شعرا ______ 105

• امام بخش ناسخ • خواجہ حیدر علی آتش • مرزا اسداللہ خاں غالب

• بہادر شاہ ظفر • مومن خاں مومن • مصطفیٰ خاں شیفتہ • انشاءاللہ خاں انشاء

(ج) غزلِ مسلسل ۱۸۵۷ء کے بعد ______ 135

• مولانا الطاف حسین حالی • امیر مینائی • داغ دہلوی

• باب: پانچ غزلِ مسلسل بیسویں صدی میں ______ 150

• اقبال • نظم طباطبائی • عزیز لکھنوی • جوش ملیح آبادی

• اختر شیرانی • فانی بدایونی • حسرت موہانی • اصغر گونڈوی

• جگر مرادآبادی • ساغر نظامی

• باب: چھے غزلِ مسلسل اور ترقی پسند تحریک ______ 189

• مجروح سلطان پوری • مخدوم محی الدین • علی سردار جعفری

• شہریار • مغنی تبسم

• باب: سات غزلِ مسلسل عصرِ حاضر میں ______ 206

• سکندر علی وجد • صاحب زادہ میکش • ناصر کاظمی • وحید اختر

• شاذ تمکنت • سعید شہیدی • بانو طاہرہ سعید • رحمٰن جامی

• مصطفیٰ مجاز • جعفر رضا • علیم صبا نویدی

• باب: آٹھ اختتامیہ ______ 239

• ______ کتابیات ______ 266

○●○

ابتدائیہ

◆◆◆

G M Ibt
1

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں شکر بجا لاتا ہوں کہ اس کے فضل و کرم کے طفیل میں یہ مقالہ مکمل کر سکا۔ شعبہء اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پی ایچ۔ ڈی، میں داخلے کے بعد موضوع کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا تو یہ طے پایا کہ میں پاکستان کے مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کو موضوعِ تحقیق بناؤں۔ لیکن جب میں نے اس موضوع پر مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو کچھ ہی عرصہ بعد یہ احساس ہوا کہ مجھ سے پہلے ہندو پاک کی مختلف جامعات میں مختلف اسکالروں نے مختلف جہتوں سے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ اب میرے لیے اس میں اضافے کی کوئی بڑی گنجائش باقی نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنے گائیڈ سے موضوع کی تبدیلی کے بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ موضوع کی تبدیلی ممکن ہے۔ تب میں نے اردو کے ممتاز محقق و دانشور پروفیسر مغنی تبسم، سابق صدر، شعبہء اردو، عثمانیہ یونیورسٹی سے اپنے تحقیقی موضوع کے تعین کے سلسلے میں مشاورت کی۔ انھوں نے غزل سے میری دل چسپی کے پیشِ نظر غزل پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ حالاں کہ اردو غزل پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم پروفیسر مغنی تبسم کے ذہنِ رسا نے میرے لیے ایک ایسا گوشہ نکال ہی لیا جس پر بہت کم لکھا گیا ہے یعنی "اردو میں غزلِ مسلسل"۔ اس طرح میرا موضوع "اردو میں

غزلِ مسلسل، روایت اور فن" طے پایا۔

اردو میں غزلِ مسلسل کی روایت نہایت قدیم ہے۔ جب ہم اردو میں غزلِ مسلسل کے گنج ہائے گراں مایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دو ایک مضامین و مقالات سے قطعِ نظر اس صنف پر مستقل کام نہیں ہوا ہے۔ بہت سے بہت یہ ہوا کہ اگر کسی شاعر پر کام کیا گیا تو اس کے ہاں غزلِ مسلسل کی نشان دہی کی گئی اور بس! ضرورت تھی کہ غزلِ مسلسل کو موضوع بنا کر اس پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ اردو میں اس کی روایت کے آغاز و ارتقا اور اس کے مختلف مرحلوں اور منزلوں کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ پیشِ نظر مقالے میں اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا کے حوالے سے اسی کمی کی تا بہ حدِ امکان پا بجائی کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مقالہ جملہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان "غزل پس منظر اور منظر" ہے۔ اس باب میں عربی قصیدے اور فارسی شاعری میں صنفِ غزل کے آغاز و ارتقا پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اردو میں غزل کے آغاز اور اس کے فنی لوازم، اصول و مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں قدما کے ہاں غزل کے موضوعات کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے موضوعات میں عہد بہ عہد واقع ہونے والی تبدیلیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان "غزلِ مسلسل: ہیئت اور ٹکنک" ہے۔ اس باب میں غزل کی روایت کے پس منظر میں غزلِ مسلسل کے فن اور ٹکنک سے متعلق اصولی مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں غزلِ مسلسل کے متعلق بعض نقادوں جیسے اختر انصاری اور عبادت بریلوی وغیرہ کے خیالات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور غزلِ مسلسل کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم کا عنوان "غزلِ مسلسل دکن میں" ہے۔ اس باب کو تین ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔ (الف) غزلِ مسلسل دبستان گولکنڈہ میں (ب) غزلِ مسلسل دبستان بیجاپور میں اور (ج) غزلِ مسلسل دبستانِ اورنگ آباد میں۔

(الف) دکن میں اردو شاعری کا جائزہ لیں تو ہماری نظر سب سے پہلے دبستانِ گولکنڈہ کے غزل گو شعرا میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان عبداللہ قطب شاہ اور ملا غواصی پر پڑتی ہے ان کے ہاں غزلِ مسلسل کے

نمونے ملتے ہیں۔ ان شعرا کی مسلسل غزلوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

(ب) بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین نے بھی گولکنڈہ قطب شاہی سلاطین کی طرح نہ صرف شعر و ادب کی سرپرستی کی ہے بلکہ خود بھی معرکہ کے شعر کہے ہیں۔ اس باب میں علی عادل شاہ شاہی، میراں ہاشمی، معظم بیجاپوری اور حسن شوقی کی مسلسل غزلوں سے بحث کرتے ہوئے ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

(ج) اس باب کا آخری حصہ دبستانِ اورنگ آباد کی غزلوں سے متعلق ہے۔ اس دبستان کے شعرا نے بڑی خوب صورت غزلیاتِ مسلسل کہی ہیں۔ اس باب میں ولی کے علاوہ سراج اور داؤد اورنگ آبادی کی مسلسل غزلوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان " غزلِ مسلسل شمالی ہند میں " اس باب کو تین ذیلی عنوانات (الف) " غزلِ مسلسل عہد میر میں" ہے۔ میر کے کلیات میں غزل مسلسل تلاش کرتے ہوئے ان غزلیات کو نقد و نظر کا موضوع بنایا گیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خواجہ میر درد کی غزلِ مسلسل کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کا دوسرا ذیلی عنوان (ب) ناسخ، غالب اور ان کے ہم عصروں کے ہاں غزلِ مسلسل سے متعلق ہے۔ جس میں اس دور کے چنندہ شعرا کی غزلیاتِ مسلسل کا تذکرہ کیا گیا ہے اور تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب کے ذیلی عنوان (ج) "غزلِ مسلسل ۱۸۵۷ء کے بعد" میں حالی کے ساتھ جن شعرا کی مسلسل غزلوں کی تحسین پیش کی گئی ہے ان میں امیر مینائی اور داغ دہلوی شامل ہیں۔

اس مقالے کا پانچواں باب "غزلِ مسلسل اور بیسویں صدی" ہے۔ بیسویں صدی کے دیگر اہم شاعروں میں اقبال، نظم طباطبائی، عزیز لکھنوی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی اور ساغر نظامی کی غزلیاتِ مسلسل کا شرح و بسط کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔

چھٹا باب "غزلِ مسلسل اور ترقی پسند تحریک" ہے۔ اس باب میں مجروح سلطان پوری، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شہریار اور مغنی تبسم کی مسلسل غزلیات پر گفتگو کی گئی ہے۔

ساتواں باب "غزلِ مسلسل عصرِ حاضر میں" ہے۔ جس میں راقم الحروف نے ایسے شاعروں کے ہاں

غزلِ مسلسل کی تلاش کی اور ان کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے کسی تحریک یا نظریہ سے اپنی خصوصی وابستگی قائم نہیں کی۔ انھوں نے اپنی مرضی سے کہا اور اپنے انداز سے ایسے شاعروں میں سکندر علی وجد، صاحب زادہ میکش، ناصر کاظمی، وحید اختر، شاذ تمکنت، سعید شہیدی، بانو طاہرہ سعید، رحمٰن جامی، مصنظر مجاز، جعفر رضا اور علیم صبانویدی، شامل ہیں۔ اس باب میں مذکورہ شعرا کی غزلیاتِ مسلسل کے حوالے سے غزلِ مسلسل کی روایت کی توسیع پر روشنی ڈالی گی ہے۔

آٹھواں اور آخری باب "اختتامیہ" ہے۔ جس میں غزلِ مسلسل کی روایت اور فن مختلف ادوار میں مختلف شعرا کی غزلیاتِ مسلسل پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کتابیات درج کی گئی ہے۔

اس تحقیق کے دوران راقم کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑا، ایک مرحلہ ہے کتب خانوں کا، کتب خانے سماج کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں جہاں ہماری تہذیب و تمدن کی تاریخ محفوظ رہتی ہے۔ یہ کتابی صورت میں ہمیں میّسر ہوتی ہے۔ آج کے اس انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اور بھی ترقی ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے اپنی تحقیق کے دوران سرکاری، نیم سرکاری اور نجی کتب خانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جن میں اندرا گاندھی میموریل لائبریری یونیورسٹی آف حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، لائبریری ادارہ ادبیات اردو، سالار جنگ میوزیم لائبریری، نظام ٹرسٹ لائبریری کے علاوہ پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر محمد علی اثر اور پروفیسر رحمت یوسف زئی کے نجی کتب خانے بھی شامل ہیں۔ میں ان تمام کے منتظمین احباب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

کوئی بھی اسکالر اپنے اساتذہ، کرم فرماؤں اور احباب کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی صاحب صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، ایک اچھے استاد ہی نہیں، ایک رحم دل انسان بھی ہیں۔ ان کی ہمت افزائی اور مفید مشوروں نے میرے اس تحقیقی مقالے کو تکمیل تک پہنچایا۔ میں اپنے استاد محترم کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ استاذی پروفیسر محمد انوار الدین صاحب سے میں نے تحقیق کا فن سیکھا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا، ان کی شفقتیں میرا گراں مایہ ہیں۔ میں اپنے محترم استاد کا بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر میر محبوب حسین صاحب، ریڈر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے جو میرے پی ایچ۔ ڈی، کے رہنما بھی ہیں۔ میری اس تحقیق کے دوران میری مجبوریوں اور کوتاہیوں کو ہر بار نظر انداز کیا، کام کی تکمیل کے لیے بارہا توجہ دلاتے رہے۔ وہ بہت مخلص انسان ہیں۔ ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار صاحب لکچرار شعبہ اردو، میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، مجھے ادبی دنیا سے متعارف کروانے کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس صاحب لکچرار شعبہ اردو، کی کرم فرمائیاں میرا قیمتی اثاثہ ہیں، یہ تو اخلاص کا منبع ہیں، تحقیق کے مینارہ نور ہیں۔ شعبہ اردو میں محترمہ بسالت النساء صاحبہ کا خلوص ہم اسکالرز کبھی بھول نہیں سکتے۔ میں ان سب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

ایک اسکالر صرف مکتب ہی میں سب کچھ حاصل نہیں کرپاتا، وہ سماج میں رہتا ہے اور سماج کے مختلف حصوں سے اپنی حسبِ استطاعت Knowledge حاصل کرتا ہے۔ میرے اس تحقیقی کام کا سہرا تو میرے ایسے استاد کے سر جاتا ہے جنھیں ساری ادبی دنیا اپنا استاد تسلیم کرتی ہے۔ بہ قول محترم رحمٰن جامی "وہ تو ایک سمندر ہیں، اعلیٰ پائے کے مفکر ہیں اور ادب کا مرکز ہیں" وہ محترم المقام پروفیسر مغنی تبسم صاحب ہیں، جن کی سرپرستی نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس مقالے کو ضبطِ تحریر میں لاسکا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے شعری مزاج کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر کام کرنے کو کہا اور پھر کمپیوٹر ٹکنالوجی میں بھیج دیا جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے شاید اس مقالے کی تکمیل میں مجھے اتنا وقت لگ گیا۔ الحمدللہ بہ یک وقت علم و ہنر کی تحصیل کے مواقع حاصل ہوتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مفید مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہی کی بہ دولت مجھے ان کی ہر بڑی سے بڑی ادبی، سماجی محفلوں میں شریک ہونے اور ان کے حلقہ ارباب سے بھی کافی فیض اٹھانے کے مواقع حاصل ہوتے رہے۔ میں نے ہمیشہ بھرپور کوشش کی کہ ایسے مواقع مجھے نصیب ہوتے رہیں۔ پروفیسر سید سراج الدین صاحب، پروفیسر تقی علی مرزا صاحب، محترم اسامہ فاروقی صاحب، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب، پروفیسر بیگ احساس صاحب، سید خالد قادری صاحب، قدیر زماں صاحب، جیسے دانشور اکثر پروفیسر مغنی تبسم کے ہاں آتے اور اس طرح مجھے

ہر وقت علم کی ایک نئی روشنی ملتی رہتی۔ پروفیسر شہریار صاحب، پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ، محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ، ڈاکٹر صالحہ عثمانی صاحبہ، رفعت صدیقی صاحب، رحمٰن جامی صاحب، عبدالرحیم خاں صاحب اور نواب ملک صاحب کی ہمت افزائی شامل رہی۔ پروفیسر جعفر نظام صاحب نہ صرف ادارہ ادبیات اردو کے صدر تھے بلکہ دو میعادوں کے لیے کاکتیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ سائنس سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو شعر و ادب کی دنیا میں بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر مجھے نصیحت کرتے: "جعفر صاحب، آپ اپنی تعلیم کو جاری رکھیے خدا اس کا صلہ ضرور دے گا۔" میں میرے ان تمام کرم فرماؤں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ رب العزت انھیں دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب فرمائے۔ آمین

میرے ساتھیوں عبدالغفار، رضی الدین اقبال، سمیع اللہ، طاہر غوری، سید شاکر علی، ڈاکٹر ابرار الباقی، کلیم محی الدین، قادر محی الدین، ڈاکٹر شاہدہ تسنیم، ڈاکٹر عائشہ، انوار احمد خاں اور خاص طور پر محمد خالد بھائی، اقبال ملک و آصف ملک جو ہمیشہ میرے اس تحقیقی کام کی توجہ اس قدر شدت سے دلاتے جیسے یہ کام ان کا اپنا کام ہے۔ ان سب کی محبت میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ دعا گو ہوں کہ رب العزت ان کے نیک مقاصد دن بہ دن کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

میرے والدِ محترم عظیم انسان ہیں، میری زندگی ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ میری والدہ، معظمہ مذہبی پرہیزگار خاتون تھیں، جن کی محبت، تربیت اور دعاؤں نے ہم بھائیوں اور بہنوں کو کسی قابل بنایا، کاش! کہ آج وہ ہم میں ہوتیں۔۔۔ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

میرے برادرِ محترم احمد بھائی اور بھابی صاحبہ نے ہر موقع پر ہر ممکن سہولتیں اور آسانیاں فراہم بہم پہنچائیں اور مجھے میری والدہ کی کمی کو محسوس ہونے نہ دیا۔ جن کی شفقتیں میں زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ میرے چھوٹے بھائی عبدالصمد، بھابی، بہنیں اور ان کے افراد خاندان، میری رفیقِ حیات، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں اور اپنے بچوں: نسرین، شہباز، سہیل، ناہید، فراز، نازنین، فرحان، ضحیٰ اور اسد ہمیشہ مجھے

ڈھیر سارا پیار دیتے رہے۔ اللہ رب العزت ان کی زندگیوں میں اخلاص و محبت بھردے اور یہ تمام پڑھ لکھ کر دنیا کے چمکتے روشن تارے بنیں۔ آمین

میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے قدرت نے ان تمام ادب نواز اساتذہ، خوش مزاج افرادِ خاندان اور ذی فہم دوست احباب کا تعاون عطا کیا، میں ان بھرپور عنایتوں سے سرشار اپنے خالق کے آگے سربہ سجود ہوں۔ سبحان ربی العالیٰ ○

محمد جعفر

ریسرچ اسکالر،

یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

GM1

(باب۔ایک)

غزل: پس منظر اور منظر

◆◆◆

عربی قصیدے نے زمانہ جاہلیت میں عروج و ارتقا کی منزلیں طے کی تھیں۔ اسی ایک صنف سخن پر ساری عربی شاعری مشتمل تھی۔ پھر اسلام کی ابتداء ہوئی اور اسلامی اقدارِ حیات کی اشاعت و مقبولیت نے اس قبائلی عصبیت کو محو کر دیا جو جاہلیت کے محرکات میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ غالباً اسی باعث خلافتِ راشدہ کے دور میں عربی شاعری اس جوش و خروش سے محروم رہی جو زمانہ قبلِ اسلام میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت تھی بنی اُمیّہ کے عہد میں اس بدویانہ زندگی کی قدروں نے ایک دفعہ پھر اپنا رنگ جمالیا اور عربی قصیدے میں دوبارہ وہی آن بان پیدا ہو گئی۔

یہی وہ قصیدہ ہے جو عربوں کے ساتھ ایران پہنچا اور یہاں اسس نے غزل کو جنم دیا۔ ایرانیوں نے قصیدے کی تشبیب کو قصیدے سے الگ کر کے غزل کا پیکر تیار کیا، یہی نہیں دوسری اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، مسمط، دو بیتی، رباعی اور قطعے کو بھی اپنایا۔ مگر ایرانی شعرا نے غزل پر ہی اپنی بیش تر توتیں صرف کیں چناں چہ فارسی شاعری کی اصلی ترقی غزل کے نشوونما اور ارتقا سے جڑی ہوئی ہے۔ یوں ایرانی شاعری کی تمام اصناف نہ صرف اپنی ترقی بلکہ وجود و بقا کے لیے غزل ہی کی مرہونِ منت رہی ہیں۔

فارسی غزل کا ارتقا عباسیوں کے عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی فن و ثقافت کے ارتقا کے ساتھ اپنے عروج کو پہنچا اور یہی عروج یافتہ اور فروغ یافتہ غزل وہ تناور درخت تھا جس کی قلم ہندستان میں لاکر لگائی گئی۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہر زبان کی شاعری اپنے ابتدائی دور میں جو بالعموم کئی کئی صدیوں کے طویل زمانے سے عبارت ہوتا ہے، ایک طفلانہ اور معصومانہ سادگی کے سوا کوئی دوسری اعلیٰ ادبی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ مگر فارسی شاعری کے گراں بہا عطیے کی بنا پر اردو شاعری کا یہ ابتدائی دورِ طفولیت بہت ہی مختصر ہوگیا۔ اردو شاعری کو اپنے سفر کے سب سے پہلے مرحلے پر ہی ایسے بھرپور اور مکمل زادِ راہ کا میسر آجانا ہی ایسا امتیاز ہے جو کسی دوسری زبان کے حصے میں نہیں آیا۔ خود فارسی نے جو پختگی اور رچاؤ کم سے کم سات آٹھ صدیوں میں پیدا کیا تھا وہ اردو شاعری نے زیادہ سے زیادہ دو صدیوں میں حاصل کرلیا۔

بہ قول "گلِ رعنا" کے مصنف "اردو شاعری کی ابتداء فارسی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے۔ خود ہندستان میں ایسے لوگ موجود تھے جو عربی اور فارسی کی روایات پر عبور رکھتے تھے۔ صنفِ غزل جو ایران کی شاعری سے ہمارے ہاتھوں تک پہنچی تھی ایک زندہ صنف تھی اور زندگی کے امکانات سے بھرپور تھی۔ پھر کہنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف اس کی زندگی کو برقرار رکھا، بلکہ اس کو نئے مقامات اور نئی منزلوں سے گزارا، ایک غیر ملکی اور اجنبی صنفِ سخن کو پوری طرح اپنالیا اور اپنے ذوقِ شعر اور احساسِ حسن کے ساتھ اسے پورے طور پر ہم آہنگ کرلیا، ہم نے ایرانی شاعروں کی آواز میں اپنی آواز کا اضافہ کیا، قدیم اور کلاسیکی استعاروں اور علامتوں کو رسمی و روایتی مضامین کے علاوہ اپنے مخصوص احساسات، تصورات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ایرانی تغزل کے نغموں میں نئی گونجیں، نئی تانیں، نئی گہرائیاں اور نئی تہیں پیدا کیں، نئے کس بل سے مسلح کیا اور نئے رنگ و آہنگ سے آراستہ کیا۔ مختصر یہ کہ ہم نے ایک قدیم اور رواجی صنفِ سخن کو بڑی حد تک اپنے ماحول، اپنے حالات، اپنی ذہنیت اور اپنے مزاج کا ترجمان بنایا۔ چناں چہ صنفِ غزل ہمارے ہاتھوں پہنچنے کے بعد متعدد ادوار اور بے شمار تغیرات سے گزری ہے۔

ہر زبان ابتدا بول چال کے کام میں لائی گئی۔ شروع ہی سے کسی زبان میں کتابیں نہیں لکھی گئیں بلکہ پہلے پہلے اس میں جملے، فقرے، اقوال اور کہاوتیں ملتی ہیں پھر لوگ اس میں شعر کہنے لگتے ہیں اور کتابیں تیار ہونے لگتی ہیں۔ شمالی ہندستان کے صوفیوں، فقیروں اور درویشوں کے یہاں تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں ایسے جملے اور بول ملنے لگتے ہیں جن کو اردو کہہ سکتے ہیں مگر جس کو ہم شعر و ادب کہتے ہیں، اس کا سلسلہ دکن سے شروع ہوا۔ دکن کا سارا علاقہ شمالی ہند سے الگ تھلگ رہا ہے جب کہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کی سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" دکن کی ہے۔ دکن میں اردو عام لوگوں سے ہوتی ہوئی راج دربار میں پہنچ گئی اور بادشاہ تک اس میں شاعری کرنے لگے۔

بہمنی سلطنت ٹوٹ پھوٹ کر پانچ حصوں میں بٹ گئی۔ سب میں الگ الگ بادشاہ ہونے لگے، گجرات بھی آزاد ہو گیا۔ دکنی سلطنتوں میں گولکنڈہ اور بیجاپور قریب قریب دو سو برس تک قائم رہے۔ یہاں کیا بادشاہ، کیا امیر، کیا خواص کیا عوام سب اسی اردو کے عاشق تھے۔ یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر عام لوگوں کو اس زبان کی ضرورت نہ ہوتی اور وہ اس زبان کو استعمال نہ کرتے تو بادشاہوں کی سرپرستی یا دلچسپی سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دکن میں اردو کی اتنی تیزی سے ترقی ہوئی کہ یہاں سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں ہم کو کئی شاعروں اور کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ جو بادشاہِ وقت تھا اور جس نے حیدر آباد شہر بسایا اور بہت سی یادگار عمارتیں بنوائیں خود بھی اردو کا بہت بڑا شاعر تھا جس کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ شمال میں مغل بادشاہ اکبرِ اعظم کا دور تھا۔

یہی حال بیجاپور کا تھا، گولکنڈے میں قطب شاہی خاندان تھا تو بیجاپور میں عادل شاہی۔ یہاں بھی اردو کا بول بالا تھا۔ یہاں کے سلاطین میں ابراہیم عادل شاہ بھی ایک پرگو شاعر گزرا ہے۔ اس نے بھی ملی جلی زبانوں میں گیتوں بھری لاجواب کتاب لکھی جس کا نام "نورس" ہے۔ یہاں کے بادشاہوں نے نہ صرف خود شاعری کی بلکہ شاعروں کی سرپرستی کی، عادل شاہی زمانے کے مشہور شعراء نصرتی، ہاشمی اور رستمی، کا کلام پڑھنے

سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں افق شاعری کتنا روشن اور جگمگاتا تھا۔

یہ دونوں سلطنتیں اردو کی زبردست سرپرستی کر رہی تھیں کہ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے ۱۶۸۶ء اور ۱۶۸۷ء میں ان پر قبضہ کرلیا اور بہت دنوں تک آزاد رہنے کے بعد دکن کی ریاستیں پھر دلّی کے ماتحت ہو گئیں۔ یہاں سے دکن کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ شعروشاعری کا چرچا ختم نہیں ہوا مگر حالات بدل گئے، دکن نے شمالی ہند پر اپنا اثر ڈالا اور شمالی ہند کی زبان نے دکن کو بہت کچھ دیا۔ اس عمل اور ردِ عمل سے لسانی اور شعری و ادبی نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

دکن کی ریاستیں مغل حکومت کا ایک حصہ بن گئیں، اس وقت بھی جو لوگ شاعری کر رہے تھے انھوں نے شاعری کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔ اس بات کو پھر ایک بار یاد دلایا جاتا ہے کہ شاعری صرف بادشاہوں اور درباروں کی وجہ سے زندہ نہیں رہتی اسے عام لوگ زندہ رکھتے ہیں۔ شمالی ہند میں بول چال کی زبان تو اردو تھی مگر اس میں شاعری بہت کم ہوتی تھی۔ جب یہاں کے شاعروں نے دکن کی اردو شاعری کو دیکھا تو انھوں نے بھی فارسی چھوڑ کر اردو ہی میں کہنا شروع کیا۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں دکن کے سب سے مشہور شاعر ولی دکنی کا نام بہت اہم ہے۔ ان کو اردو شاعری کا "باوا آدم" بھی کہا گیا ہے۔ وہ تھے تو اورنگ آباد کے مگر رہے کبھی اورنگ آباد تو کبھی برہان پور میں، کبھی سورت میں تو کبھی دلی میں۔ اس طرح وہ شاعری کے چراغ ہر جگہ روشن کر رہے تھے۔ انھوں نے مثنویاں، رباعیاں اور نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا کمال غزلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کئی شعر تو اتنے صاف اور سادہ ہیں کہ آج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ولی جب دلّی آئے تو ان کے کلام سے متاثر ہوکر دلی کے شاعر اردو میں شعر کہنے لگے اور شاعری کا چرچہ عام ہو گیا۔ ولی کے بعد سراج اورنگ آبادی اور داؤد اورنگ آبادی جیسے شاعر پیدا ہوئے جو مرثیے، مثنویاں، نظمیں اور غزلیں وغیرہ لکھتے رہے۔

دلی میں جب شعر و ادب کا سلسلہ شروع ہوا تو جو شاعر فارسی میں لکھتے تھے انھوں نے بھی اردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ ابھی اٹھارویں صدی کی پہلی چوتھائی بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ اردو میں اچھی خاصی شاعری

شروع ہو گئی۔ خان آرزو، فطرت، مظہر جانِ جاناں، فائز، حاتم، آبرو اور ناجی جیسے مشہور شاعر اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ دلّی کی مغل حکومت کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ بادشاہ کم زور تھے، ایک کے بعد دوسرے کو تخت پر بٹھایا جارہا تھا۔ بدامنی کی حالت تھی، نادر شاہ کا حملہ ہوا، مرہٹوں، روہیلوں اور سکھوں کا زور بڑھنے لگا، جو دور کے علاقے تھے وہاں کے صوبہ دار اور حاکم خود مختار ہو گئے۔ ایسے حالات میں کسی بھی زبان کا ادب فروغ نہیں پاتا مگر پھر بھی اردو شاعری کے قریب قریب سو سال کے اس دور میں، جسے اردو شاعری کا سنہری زمانہ کہہ سکتے ہیں، اگر دکن کے زمانہ، شاعری کو بھی شامل کرلیں تو اب اردو شاعری کی عمر تین سو سال کے قریب قریب پہنچ گئی تھی۔ ۱۷۵۰ء کے بعد جن بڑے بڑے شاعروں کے نام ہم کو ملتے ہیں ان میں خواجہ میر درد، میر تقی میر، میر محمد سوز، مرزا محمد رفیع سودا، عبدالحی تاباں، قیام الدین قائم چاندپوری، فغاں، ممنون، یقین اور میر ضاحک وغیرہ شامل ہیں۔

جب دلّی رہنے کے قابل نہیں رہی تو ان شعرا میں سے متعدد فرخ آباد اور ٹانڈہ کے نوابوں کے یہاں چلے گئے جہاں ان کی بہت عزت ہوئی۔ اودھ کی حکومت بھی قائم ہو چکی تھی۔ لکھنو میں نواب شجاع الدولہ، پھر ان کی جگہ آصف الدولہ نے شعروادب کی سرپرستی کی۔ بہتیرے شعرا دلی چھوڑ کر اودھ کی طرف چلے گئے لیکن ان سب شاعروں کو دلی ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ ابھی سودا اور میر کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنو کے افق پر نئے ستارے نمودار ہوئے جن میں زیادہ مشہور غلام ہمدانی مصحفی، امان، جرات اور انشاء ہیں۔ گو ان سب کی شاعری دلی میں شروع ہو چکی تھی جب لکھنو پہنچے تو یہاں کی دنیا دلی سے مختلف معلوم ہوئی۔ یہاں نئی حکومت کی امنگ تھی، رنگ رلیاں تھیں، عیش تھا، میلے ٹھیلے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ مختصر یہ کہ جب دلی کی بساط الٹی تو اودھ میں نئی بساط جمی اور شعروشاعری سے یہاں نہ صرف دربار بلکہ عام لوگوں نے بھی دلچسپی لی۔ اس طرح لکھنو کا اپنا الگ طرزِ شاعری بن گیا جسے ہم دبستانِ لکھنو کی شاعری کہتے ہیں۔ لکھنو بھی اردو شعر و ادب کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں غزل گوئی میں اہم نام شیخ امام بخش ناسخ اور حیدر علی آتش کے ہیں۔ اور پھر

ان کے شاگردوں میں رشک، منیر شکوہ آبادی، وزیر، رند، خلیل، نسیم وغیرہ نے اپنے اساتذہ کے رنگ کو چمکایا۔

اردو شعر و ادب کی ترقی کے سلسلے میں پہلے دکن، پھر دلی کے بعد لکھنو میں اگر زیادہ پیش رفت ہوئی تو دیگر جگہوں پر خاموشی نہیں چھائی بلکہ وقت کے بدل جانے سے کبھی ایک جگہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی، کبھی دوسری جگہ کو، سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگہ جگہ بادشاہوں، امیروں یا نوابوں کے دربار لگتے تھے، جیسے دلی، لکھنو کے علاوہ فرخ آباد، ٹانڈہ، رام پور، پٹنہ، حیدرآباد وغیرہ۔ یہاں سے شاعروں کو وظیفے ملتے تھے، ان کی عزت کی جاتی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے پچیس تیس سال پہلے دلّی میں پھر بہار آئی۔ اس وقت یہاں سیکڑوں شاعر پیدا ہوئے۔ ذوق، حکیم مومن خان مومن، مرزا اسداللہ غالب، بہادر شاہ ظفر، نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ اپنے اپنے رنگ کے استاد تھے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھنے والا تھا اس وقت دلی میں بڑے بڑے عالم اور شاعر جمع تھے اور انھیں کے دم سے دلی کا یہ آخری دور یادگار بن گیا تھا۔ حالاں کہ جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور حکومت میں جو کمزوری آ گئی تھی اسے روکنے کی طاقت کسی میں نہیں تھی۔ یہ پس منظر ہے جس میں حالی اور ان کی شاعری اور مقدمہ شعر و شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔

حالی نے غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں غزل کے لیے کوئی شے، موضوع یا رجحان ممنوع نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ غزل نئی اشیا اور موضوعات کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اپنے مخصوص رمزیہ انداز کو بروئے کار لاتی ہے، کسی اور صنفِ شعر کے مزاج کو نہیں اپناتی۔ حالی کو بھی غزل کے اس مزاج کا علم تھا لیکن اصلاح کے ایک واضح مقصد کے زیرِ اثر جب حالی نے غزل میں نئے مضامین کو داخل کرنا شروع کیا تو غزل کے مزاج کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور ان کے ہاں غزل اور نظم کا فرق مدھم پڑ گیا۔ چناں چہ یہی ہوا کہ خود حالی کی مسلسل غزلیں نظموں کی صورت اختیار کر گئیں۔ غزل کے اشعار کی مخصوص انفرادیت ختم ہو گئی۔ حالی کی اس مسلسل غزل کو پڑھنے سے اندازہ ہو گا:

❄

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقوا
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا
جس رہ گذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر
صنعاں سے راست رو کو رستہ بُھلا کے چھوڑا
فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا
عقل و خرد نے تجھ کو کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا
علم و ادب رہے ہیں دلبر ترے ہمیشہ

ہر معرکہ میں تو نے ان کو ڈلا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا
اک دست رس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

(حالی)

یہ اشعار غزل کی ہیئت کے تابع ضرور ہیں لیکن مزاجاً غزل کے اشعار سے بہت مختلف ہیں۔ بلکہ ایسی غزلوں پر اگر کوئی عنوان چسپاں کر دیا جائے تو انھیں بڑی آسانی سے نظم کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے افق کو وسیع کرنے اور نئے موضوعات کو غزل میں داخل کرنے کی یہ کاوش اس لحاظ سے تو قابل تعریف ہے کہ اس نے غزل کے جدید آہنگ کے لیے راہ ہموار کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی تہذیب نے ایک لہر سی دوڑائی۔ یہ بڑی کشمکش کا دور تھا۔ انقلابی قومی رجحانات، مذہبی میلانات اور علم وادب کے رجحانات بھی اس انقلاب میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ قومی رہنما اور رہبر بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ حالی، شبلی، وحید الدین سلیم، اسمٰعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، اکبرالہ آبادی، اقبال، ظفر علی، چکبست، داغ، حسرت، فانی، یگانہ، اصغر جیسے شعرا نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ حالی نے جب غزل کی اصلاح کی ان کے معاصرین میں بھی مثلاً اسمٰعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، وحید الدین سلیم پانی پتی کے ہاں غزلِ مسلسل لکھنے کا رجحان عام تھا۔ ان شعرا کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک تیشہ ، فولاد ہے اک پارہ ، بلّور
ہوگا کسی دلبر کا دل ایسا نہ تن ایسا
سایہ سے نظر کے بھی بگڑتا ہے ترا رنگ
پھولوں نے بھی پایا نہیں نازک بدن ایسا

ہونٹوں سے ابلتا ہے ترے چشمہ کوثر
حورانِ جناں نے بھی نہ پایا دہن ایسا
(سلیم)

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا
پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے
پہناں کے سبز خلعت ان کو جواں بنایا
(اسمٰعیل میرٹھی)

شاخ گل تک جو ذرا بار ہے پاتی بلبل
پھولوں جامے میں نہیں اپنے سماتی بلبل
ہائے تو باغ میں خالی نہیں گاتی بلبل
اور صبا گل سے ہے گُھچرے اڑاتی بلبل
ہے یہ افسانہ ، غم کس کو سناتی بلبل
دھوم سے فصلِ بہار اب کے ہے آتی بلبل
(محمد حسین آزاد)

حالی کے دور کی غزل کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ انھوں نے غزل کو عجمی اثرات سے ایک حد تک آزاد کرنے کی کوشش کی۔ دراصل غدر کے بعد جب انگریزی حکومت باقاعدہ طور پر قائم ہوئی تو ردِ عمل کے طور پر قومی احساس کو تحریک ملی اور اخبارات ہی کے ذریعے نہیں بلکہ سیاسی جماعتوں نے بھی مِلّی اور قومی جذبات کا

عام طور سے اظہار کیا۔ شعر کو ایرانی اثرات سے باہر نکال کر خالص ہندوستانی فضا کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کی یہ ساری تحریک اسی جذبے کا نتیجہ تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی غزل نئے روپ میں نیا لباس پہن کر محفل کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ اس شاعری میں رسمی خیالات کم ہوتے گئے۔ اس میں سچائی کے ساتھ دل کی باتیں لکھی جانے لگیں۔ اب اقبال، شاد، حسرت، صفی، سیماب، اصغر، فانی، عزیز، ثاقب، جگر، اثر، یگانہ، فراق اور اقبال وغیرہ نے اس میں نئی روح پھونکی۔ ۱۹۳۶ء میں ملک کی حالت کچھ اور بدلی اور ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم ہوئی۔ اردو شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی جیسے حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، جوش، اختر شیرانی، جمیل مظہری، ساغر نظامی، آنند نرائن ملا وغیرہ ان سب پر وقت کے اثرات کی مہریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان شعرا کے بعد شعرا کی ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو زندگی کی الجھنوں، سیاسی اور معاشی جھگڑوں، آزادی حاصل کرنے اور ساری دنیا کے لوگوں کو خوش حال بنانے کے خوابوں کا ذکر زیادہ کرتی تھی۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں فیض، مجاز، آزاد، جذبی، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، مخدوم، جاں نثار اختر، وجد، شمیم کرہانی، ساحر، وحید اختر، باقر مہدی، راہی، ابن انشا، ن۔ م۔ راشد، میراجی، خلیل الرحمن اعظمی قابل ذکر ہیں۔ یہ سارے شعرا اپنے کلام میں سماجی شعور کا پتہ دیتے تھے اور اپنی ساری قوت انسان کی بھلائی پر صرف کر دینا چاہتے تھے کہ فن کو نقصان نہ پہنچے۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ غزل سے بڑھتی ہوئی محبت کے باوجود غزل پر دو مرتبہ شدید تنقید کی گئی۔ "مقدمہ شعروشاعری" میں حالی نے غزل میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی تھی۔ دوسری مرتبہ ترقی پسند تحریک نے غزل کو ہدفِ تنقید بنایا۔ انھوں نے غزل کی اصل روح کو سمجھنے میں لاپروائی برتی تھی۔ غزل کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ اس کی ریزہ کاری، مربوط اور مسلسل خیالات کی ادائی سے قاصر ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غزل جاگیرداری تہذیب کی علامت ہے اور اس نے ایک خاص طبقے کی معاشرت سے توانائی اور حرارت حاصل کی اور موضوعات اخذ کیے ہیں۔ احتشام حسین نے ایک دوسرے ہی

سیاق و سباق میں غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا " غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے اونچے مہذب طبقے کی چیز ہے ،اس میں عام انسان نہیں آتے " (اعتبارِ نظر ،ص : ۱۰۶) ۔ غزل پر دونوں اعتراضات بے بنیاد تھے کیوں کہ اس صنف نے ہر دور میں عام انسان کے تجربات و احساسات کی ترجمانی کی تھی اور اپنی ریزہ کاری کے باوجود اعلیٰ ترین خیالات اور تصورات کو پیش کرنے کی اہلیت کا اظہار کیا تھا ۔ غزل کا ایک بھرپور شعری زندگی کا نصاب ترتیب دیا جاسکتا ہے ۔اس کے علائم اور استعارے ہمہ گیری اور رنگارنگی کے حامل ہیں ۔ ترقی پسند شعرا میں مجروح سلطان پوری نے " وفاداری بشرطِ استواری " کے جذبے کے تحت غزل سے اپنا تعلق ہمیشہ قائم رکھا لیکن عام طور پر ترقی پسند شعرا نظم کی طرف مائل تھے ۔ بھیمڑی کی آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے یہ تجویز پیش کی تھی : " غزل اب نئے رجحانات اور نئے موضوعات کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لیے ہمارے شعرا غزل کہنے میں وقت برباد نہ کریں ۔" یہ تجویز منظور بھی ہو گئی تھی لیکن مجروح نے اس سے اختلاف کیا ۔ اس صورتِ حال کے بارے میں اپنے ایک شعر میں طنز کرتے ہیں ۔

ستم کہ تیغ قلم دیں اسی کو اے مجروح
غزل کو قتل کرے نغمے کا شکار کرے

غزل کی غیر معمولی ترسیلی قوت ،اس کے علائم کی جامعیت و لچک داری کا یہ کردار ہر عہد کے مزاج اور منقلب ہوتے ہوئے رجحانات سے ہم آہنگ رہا ۔ یہی اس کے وجود کا جواز ہے جس کی طرف جذباتیت اور ہر قدم کو رد کرنے کے رجحانات نے زیادہ توجہ کی اجازت نہیں دی ۔

چناں چہ ہزار مخالفتوں کے باوجود غزل کا قافلہ رواں دواں رہا ۔ اور آج بھی غزل نے خود کو نئے حالات اور زمانے کے مد و جزر سے ہم کنار کرلیا ہے ۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دور میں بھی غزل کا وہی بانکپن ہے جو کہ تھا ۔

○●○

(باب۔دو)

اردو میں غزلِ مسلسل، ہیئت اور تکنیک

غزل کہنے کو غزل ہے، لیکن ہر دور اور ہر زمانے میں غزل، غزل رہتے ہوئے بھی داخلی اور خارجی طور پر مختلف تجربات اور تبدیلیوں کا شکار رہی ہے یہ کچھ ایسی وسعت، لچک اور منفرد مزاج کی حامل ہے کہ ہر شاعر کی ذہنی سطح کے مطابق اس میں تبدیلی عمل میں آتی رہی ہے۔ غزل کبھی عورتوں کی باتیں یا عورتوں سے باتیں کرنے کے مفہوم کی حامل رہی ہو لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا نئے حالات و حوادث کا سامنا ہوا، معاشرتی اور تہذیبی ارتقا عمل میں آتا رہا، فکر و فن کے نئے چراغ روشن ہوتے رہے۔ غزل میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں مگر یہ تبدیلیاں خارجی کم اور داخلی زیادہ رہیں۔ یہاں تک کہ غزل اب عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کی باتیں کرنے کی بجائے خود بات کرنے کا ہنر قرار پایا۔ زمانے کے نشیب و فراز کے باوجود ایک مدت تک قافیہ اور ردیف کی پابندی، مطلع و مقطع کی قدغن، ایجاز و اختصار اور اشاریت و ایمائیت کی پابندی تو رہی لیکن اس میں بہ تدریج تبدیلیاں بھی آتی رہیں۔ یہ بات خاطر ملحوظ رہے کہ قلی اور ولی کی غزل بھی غزل ہے، ناصر کاظمی اور شاذ تمکنت کی غزل بھی غزل ہی کہی جائے گی۔ جب کہ ولی دکنی سے لے کر آج مغنی تبسم تک بھی غزل، مسلسل سفر میں ہے اور زمانے کے سرد و گرم اور اونچ نیچ کا شکار ہوتی رہی ہے۔ قلی اور ولی کی غزل میں

بھی کہیں کہیں اس دور کی زندگی اور زمانے کی باتیں، حالات کی چیرہ دستی اور ظلم و استحصال کے خلاف فرد کا احتجاج ملتا ہے۔ لیکن آج کی غزل، غزل ہوتے ہوئے بھی قطعی بدلی ہوئی اور جداگانہ غزل ہے، جس کا سلسلہ ہم کہہ لیں کہ حالی سے شروع ہوتا ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ تبدیلی اتنی مدھم اور آہستہ آہستہ عمل میں آئی ہے کہ اس کو آسانی سے گرفت میں لایا نہیں جاسکتا۔ چوں کہ زمانہ بدل رہا ہے، ہم بدل رہے ہیں، زندگی بدل رہی ہے لہٰذا ادب میں بھی ردو بدل ضروری ہے۔ اس لیے کہ ادب ہماری زندگی کا عکاس اور ترجمان ہے، تصویر، تفسیر اور تعبیر بھی۔

غزل کی اہم ترین خصوصیت اس کی رنگا رنگی ہے۔ غزل عام طور پر متنوع اور مختلف الموضوع اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ جو غزل کو گل دستے سے تشبیہہ دی گئی ہے اس کا باعث یہی ہے کہ گل دستہ ایک وحدت ہوتے ہوئے بھی کئی مختلف رنگوں مختلف خوشبوؤں بلکہ مختلف موسموں کے پھولوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر پھول گل دستے کا جزُ ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ غزل بھی بہ اعتبارِ صنف ایک اکائی ہوتے ہوئے مختلف موضوعات اور مختلف مفاہیم و مطالب کے اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہم جسے عام طور پر غزل کہتے ہیں اس کا ہر شعر ایک الگ دنیائے معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مطلع میں شاعر نے ہجر کی بات کہی ہو لیکن وہ دوسرے شعر میں وصل کی بات کہے گا، تیسرے میں گردشِ روزگار، چوتھے میں اخلاق و کردار اور پانچویں میں کچھ اور اسی طرح یہ سلسلہ مقطع تک چلتا رہتا ہے۔ غزل کے اس کردار کی وجہ سے الزام لگانے والوں نے غزل پر منتشر خیالی کا الزام لگایا اس کو وحشی صنفِ سخن قرار دیا اور قابلِ گردن زنی بھی۔ غزل پر یہ الزامات اپنی جگہ لیکن کیا کیا جائے کہ اسی انتشار اور ریزہ خیالی ہی میں غزل کا حسن اور اس کی خوب صورتی مضمر ہے۔ جس طرح گل دستہ مختلف پھولوں کا مجموعہ ہونے کے باوصف اپنا حسن رکھتا ہے، اس طرح غزل کا حسن بھی اس میں ہے کہ اس کا ہر شعر اپنے طور پر مختلف المعنی ہونے کے باوجود مجموعی طور پر غزل کا شعر ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر عصرِ حاضر کے کسی بھی شاعر کے کلام کا جائزہ لے لیں ہم اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے۔

ہماری شاعری کی دیگر اصناف خصوصاً نظم بہت زیادہ تبدیلیوں اور تغیرات سے دوچار رہیں۔ کیسی کیسی تبدیلیاں نہیں آئیں آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم، پھر وہ اصناف جو ہم نے بیرونی زبانوں سے اپنائیں یعنی: ہائیکو، تری یولے، سانیٹ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ غزل میں بھی آزاد اور نثری غزلیں ملتی ہیں۔ لیکن تکلّف برطرف، ان کی حیثیت محض چلتے چلاتے تجربے یا آنی وفانی فیشن کی طرح ہے۔ نہ تو آزاد غزل کو ہمارے ہاں کسی مستقل اور معتبر صنف کی حیثیت حاصل ہوسکی ہے اور نہ نثری غزلوں نے کوئی وقار و اعتبار پایا۔ لیکن غزل کے ان مختلف SHADES میں ایک SHADE ایسا بھی ہے جس کو بہت کم ہی سہی مگر ابتدا سے ہمارے کلاسیکی غزل گو شاعروں نے بھی اختیار کیا اور یہ SHADE شاذ ہی سہی آج بھی ہمارے شعری سرمائے میں کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے اور غزل کا یہ SHADE ہے غزلِ مسلسل۔

غزل جیسا کہ یہ حقیقت واضح ہے مختلف المضامین اور مختلف المزاج اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ خواہ پانچ اشعار پر مشتمل ہو یا اس سے زیادہ پندرہ یا اکیس اشعار پر، غزل میں ہر شعر اپنی جگہ وحدت کا حامل اور ایک اکائی ہوتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے کچھ ایسے ہی انداز سے غزل سے اپنے رویّے کو برقرار رکھا اور لگ بھگ ہر ایک نے اسی قرینے سے غزل گوئی کا کاروبار جاری رکھا۔ ہمارے ہاں مثنویاں، مرثیے اور قصیدے وغیرہ لکھے گئے جن میں ایک ہی موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا۔ دیگر موضوعات پر بھی تھوڑی بہت نظمیں ملتی ہیں لیکن بہ وجوہ نظم گوئی کا فیشن عام نہیں تھا۔ غزل گوئی ہی زیادہ تھی اور غزل گو بھی لیکن ایسے میں جب شاعروں نے ایک ہی موضوع پر اظہارِ خیال کرنا چاہا اور نظم نگاری سے اجتناب برتا تو ان کے لیے اور کوئی راہ نہیں تھی سوائے غزلِ مسلسل کے۔ چناں چہ کم کم ہی سہی غزلِ مسلسل کہی جانے لگی۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہمارے شاعر نظم گوئی کے عادی نہیں تھے کیوں کہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی جاری تھی۔ لیکن شعرا اپنی غزل مزاجی کی وجہ سے اپنے خیالات کا اظہار غزلِ مسلسل میں کرنے کے لیے مجبور تھے۔

غزلِ مسلسل بنیادی طور پر کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کا داخلی اور خارجی ڈھانچہ عام غزل سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہی مطلع، وہی بحر اور وہی زمین، مقطع، قافیے اور ردیف کی پابندی بھی وہی لیکن چوں کہ شاعر اپنے

مافی الضمیر کو صرف دو مصرعوں میں ادا کر کے متشفی نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے خیالات کو اسی بحر اسی زمین اور انہی قافیے اور ردیف کے ذریعے ظاہر کرتا جاتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے نظم کا پیرایہ کیوں اختیار نہیں کیا اور غزلِ مسلسل کو جو ایک طرح نظم ہی ہے غزل کہنے پر کیوں مصر ہے۔ اس کا جواب نہایت سادہ اور آسان ہے۔ غزل ہمارے انفرادی مزاج اور معاشرے میں ایسی رچ بس گئی ہے اور شاعروں کی یہ اتنی عزیز ترین صنف ہے کہ وہ اس سے اپنے رشتے کو منقطع کرنا نہیں چاہتے۔ غزلِ مسلسل کو آپ ایک طرح نظم کہہ لیں لیکن یہ غزل ہی ہے۔

ہمارے ہاں مختلف اصحابِ تنقید نے غزلِ مسلسل کی ہیئت اور نوعیت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ غزلیں بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں مسلسل اور غیر مسلسل۔ ان اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ مسلسل غزل وہ ہے جس کے سب اشعار سلسلہ بہ سلسلہ ایک دوسرے سے مربوط و منسلک ہوں۔ اس خصوص میں کہا جاسکتا ہے کہ ان اشعار کو قطعہ بند کیوں نہ کہا جائے۔ کیوں کہ جب شاعر اپنے مافی الضمیر کو اختصار کے ساتھ دو مصرعوں میں پیش نہیں کرتا بلکہ اسے پھیلا کر دو یا دو سے زیادہ اشعار میں پیش کرتا ہے تو ان مسلسل اشعار کو قطعہ کہا جاتا ہے اور مجموعی طور پر یہ اشعار قطعہ بند کہے جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ قطعہ بند اشعار عام غزلوں کی طرح جداگانہ مفہوم کے حامل نہ ہوں گے بلکہ ہر شعر ایک دوسرے سے یوں ملا ہوا ہوگا جیسے کسی زنجیر کی کڑیاں۔

ہمارے ناقدین نے غزلِ غیر مسلسل کی تعریف یوں کی ہے کہ اس کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل اور ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ گویا ایسی غزل کے اشعار اپنے مفہوم و مطلب کی ادائی کے لیے ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوں، ہمارے ہاں غزلِ غیر مسلسل کی اس تعریف کو مجموعی طور پر قبول تو کرلیا گیا ہے لیکن غزلِ غیر مسلسل کے سلسلے میں دوسرے مکتبِ خیال کے زاویہ ءنگاہ سے غزل کو چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

- اول تو وہ غزلِ مسلسل ہے جس میں تسلسل کی بنیاد محض تکرارِ مضمون پر ہو۔ یعنی اس میں ارتباط یا تسلسل صرف اس زاویے سے ہو کہ اس غزل کے تمام اشعار کا موضوع ایک ہی ہو یا مختلف اشعار میں ایک

مفہوم کو مختلف پیرایوں میں ظاہر کیا جائے۔

- دوسری قسم وہ غزلِ مسلسل ہے جس میں نہ صرف خیال کا تسلسل ہو بلکہ ارتقاءِ خیال بھی پایا جائے۔ گویا خیال کا سلسلہ آنے والے ہر شعر میں آگے بڑھتا رہے اور آخری شعر تک یہ وسعت پاتا اور پھیلتا جائے کہ ساری غزل ایک موضوع کے اشعار کی حامل ہو۔ ایسی غزلیں بیانیہ انداز کی حامل ہوتی ہیں۔
- اس مکتبِ خیال نے غزل کی تیسری قسم ایسی غزلِ مسلسل کو قرار دیا ہے جس میں عام غزلوں کی طرح ہر شعر علاحدہ مضمون کا حامل ہو۔ غزل کی یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے غزل بدنام بھی ہوئی اور کہنے والوں نے ایسی غزل کو پراگندیِ فکر، ذہنی انتشار اور ریزہ خیالی کی شاعری قرار دیا۔
- غزل کی چوتھی قسم اس طرزِ فکر کے نزدیک وہ غزلِ غیر مسلسل ہے جس میں ظاہری و خارجی ربط و تسلسل کے فقدان کے باوجود ایک جذباتی یک رنگی اور ایک کیفیاتی وحدت پائی جائے۔ ایسی غزلیں اپنی مخصوص تخیلی فضا کے باعث بے ربطیِ فکر کے احساس کو قطعی ختم کر دیتی ہیں۔ اختر انصاری نے اس خصوص میں خاصی وضاحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "قدما کے اصول کی رو سے غزل دو قسم کی ہو سکتی ہے: مسلسل اور غیر مسلسل، مسلسل غزل وہ ہے جس کے سب اشعار سلسلہ بہ سلسلہ ایک دوسرے سے مربوط ہوں، نہ یہ کہ ہر شعر مختلف اور جداگانہ مفہوم کا حامل ہو۔ غزلِ غیر مسلسل اس کو کہیں گے جس کا ہر شعر ایک جداگانہ مضمون کا حامل اور بجائے خود ایک مستقل اکائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کے مختلف اشعار مفہوم و مطلب کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کی اس تقسیم کو ہمیشہ بلا چوں و چرا تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو غزل کو دو نہیں چار قسموں پر مشتمل خیال کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح:

(الف) وہ غزلِ مسلسل جس میں تسلسل کی بنیاد محض تکرارِ مضمون ہو یعنی

اس میں ربط و تسلسل صرف اس معنی میں پایا جائے کہ تمام اشعار ایک ہی مفہوم سے متعلق ہوں، یا یہ کہ مختلف اشعار میں ایک ہی مفہوم کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا جائے

(ب) وہ غزلِ مسلسل جس میں نہ صرف تسلسلِ خیال بلکہ ارتقائے خیال بھی پایا جائے۔ یعنی اس میں سلسلہ ء خیال شعر کے ساتھ آگے بڑھے اور آخری شعر تک اسی طرح پھیلتا اور وسعت اختیار کرتا چلا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی غزل روائی یا بیانیہ انداز کا مجموعہ ءاشعار ہوگی۔

(ج) وہ غزلِ غیر مسلسل یعنی عام نہج واسلوب والی غزل جس کے ہر شعر میں ایک جداگانہ مضمون ہوتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر معترضینِ غزل، غزل کی شاعری کو پراگندگیِ فکر، ذہنی انتشار اور ریزہ خیالی کی شاعری قرار دیتے ہیں۔

(د) وہ غزلِ غیر مسلسل جس میں ظاہری و خارجی ربط و تسلسل کے فقدان کے باوجود ایک جذباتی یک رنگی ایک کیفیاتی وحدت ضرور پائی جاتی ہے جو غزل کے تمام اشعار کو ایک مخصوص موڈ اور ایک مخصوص تخیلی فضا کے زیرِ اثر لاکر بے ربطیِ فکر کے احساس کو بالکل ختم کردیتی ہے۔"

["غزل اور غزل کی تعلیم" مصنف، اختر انصاری۔ ص، ۶۶۔ ۶۷۔

ناشر: ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی۔ دوسرا ایڈیشن: ۱۹۸۶ء]

غزلِ مسلسل کے بارے میں کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ غزلِ غیر مسلسل سے اتنی زیادہ مختلف اور بدلی ہوئی ہے کہ اس کو قطعی ایک علاحدہ صنفِ سخن قرار دینا چاہیے۔ یہ ادعا محلِ نظر ہے کیوں کہ یہ بنیادی طور پر غزل ہی ہوتی ہے اپنی ہیئت کے اعتبار سے اور فنی زاویے سے بھی۔ اور تو اور ابتداء سے آج تک جن شاعروں نے غزلِ مسلسل کہی ہے انھوں نے بھی ایسی غزل کو غزلِ مسلسل کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا ہے۔ غزل کی ابتدائی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غزل بنیادی طور پر عربی قصیدے کا ایک جزو تھی جس کو

عشقیہ تشبیب یا تمہید کا درجہ حاصل رہا۔ تشبیب یا تمہید ہوتے ہوئے بھی یہ قصیدے کا جزو رہی جس میں ایک ہی خیال کو خواہ اس میں محبوب کا سراپا ہو، کوئی خوب صورت منظر کا بیان ہو یا کوئی عشقیہ واردات تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو جیسے محسن کاکوروی کے قصیدہ، لامیہ سے تشبیب کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا میں بادل
کالے کوسوں سے نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ
کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل
دُھر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابر پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالہ، ظلمت میں گورنر جنرل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھیے ہوتے ہیں سری کرشن کے کیوں کر درشن

سینہ ء تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی
بحر اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہل چل
قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاجِ عالی
لالہ ء باغ سے ہندوے فلک کھیم کسل
شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں
لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منھ پر آنچل
شاہد کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

[" گل دستہ ء حضرت محسن کاکوروی "

مرتبہ : شیخ الہ بخش گنائی لاہوری ۔ ص: ۳۵ - ۳۶ ۔ اشاعت: ۱۳۳۲ ہجری

ناشر: شیخ جان محمد الہ بخش تاجرانِ کتب لاہور ۔ بار اول ۔

یہ اعزاز ان فارسی شعرا کو ہی جاتا ہے جنھوں نے قصیدے کی تشبیب یا تمہید کو قصیدے سے الگ کر کے ایک مستقل صنف کی حیثیت دی۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ غزل بنیادی طور پر غزلِ مسلسل ہی کا نام ہے۔ جس میں بعد ازاں نہ جانے کن اسباب کے تحت منتشر الخیالی راہ پا گئی کہ پوری غزل ایک وحدت قرار دیے جانے کی بجائے ہر شعر کی دنیا الگ ہو گئی اور ہر شعر ایک اکائی قرار پایا۔ اگر ہم اردو غزل کے ابتدائی نمونوں کا جائزہ لیں تو یہ بات آسانی سے ظاہر ہوگی کہ ابتدا میں غزلیں دراصل تشبیب کی حیثیت ہی رکھتی تھیں جن کو آج کی اصطلاح میں غزلِ مسلسل کہہ لیجیے۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزلیں ایسی ہی ہیں جن کو خواہ کوئی عنوان دے دیا گیا ہو لیکن یہ ہیں تو تشبیب ہی جس میں محبوب کا سراپا کھینچا گیا ہے۔ آپ انھیں غزلِ مسلسل کہنے میں تکلف نہیں کریں گے۔ غزلِ مسلسل میں جب تسلسل پیدا ہوتا ہے وہ اگر دیکھا جائے تو دو زاویوں سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ جذبے یا کیفیت کی وحدت ہو کہ شاعر نے اس جذبہ و کیفیت کے باعث اپنی غزل میں ایک مخصوص تسلسلِ خیال پیدا کیا۔ دوسری صورت وہ ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کو غزل کی ہیئت میں پیش کرتا ہے یہ بہ ظاہر غزل تو ہوتی ہے جس میں ردیف، قافیے وغیرہ کی پابندی بھی کی جاتی ہے لیکن ان اشعار کو کوئی ایک عنوان دے دیا جائے تو نظم بن جاتی ہے۔ عام غزل میں اشعار کی کچھ ایسی خاص ترتیب ضروری نہیں سوائے اس کے کہ مطلع اور مقطع اپنی جگہ پر ہوں۔ اس سے قطع نظر آٹھواں یا نواں شعر چوتھا ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غزلِ غیر مسلسل کا ڈھانچہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے، جب کہ غزلِ مسلسل کی بنیاد نظم کی طرح بڑی حد تک اشعار کی مخصوص ترتیب پر ہوتی ہے۔ جس طرح نظم میں ہم اشعار یا مصرعوں کی ترتیب بدل نہیں سکتے اسی طرح غزلِ مسلسل میں بھی اشعار کی ترتیب بدل دینا ممکن نہیں (اگر ایسا ہو تو یہ غزل کا خون کرنا ہوگا)۔ لیکن غزلِ غیر مسلسل میں شاعر کو پوری آزادی ہے۔ وہ جس طرح چاہے غزل کے اشعار پیش کرے، مطلع کے بعد آٹھواں شعر اس کے بعد چوتھا یا جیسے جیسے اشعار اسے یاد آتے جائیں وہ پیش کرتا جائے، اس میں ترتیب ضروری نہیں۔ بنیادی طور پر غزلِ مسلسل اور غزلِ غیر مسلسل کا یہی اصل امتیاز ہے۔

غزلِ مسلسل کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ ایک طرح سے نظم سے مماثلت رکھتی ہے تو پھر

بہ طور علاحدہ اکائی کے اس کی کیا ضرورت ہے اس لیے کہ نظم اور غزلِ مسلسل میں کئی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ موضوع ایک ہوتا ہے اشعار کی ترتیب بدلی نہیں جاسکتی، تسلسلِ خیال بھی ایک طرح سے ضروری ہے بلکہ نقطہء عروج بھی۔ ان میں فرق اگر ہوتا ہے تو یہ کہ نظم کو کوئی عنوان دیا جاتا ہے اور غزلِ مسلسل کسی عنوان کے بغیر ہوتی ہے اور اگر اس کو بھی کوئی عنوان دے دیا جائے تو یہ بھی نظم کہلائے گی۔ غزلِ مسلسل کو انفرادی اور جداگانہ اکائی قرار دینے والے کہیں گے کہ غزلِ مسلسل اور نظم میں خواہ کتنی ہی مماثلتیں پائی جائیں غزلِ مسلسل اس لیے ایک جداگانہ اور امتیازی صِنف ہے کہ اس میں غزل کے جو آداب اور فنی نکات ہیں ان کی پابندی کی جاتی ہے۔ مطلع اور مقطع بلکہ حسن مطلع بھی اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کی تعداد اور اسلوب اور ڈکشن بھی بتا دیتا ہے کہ میں نظم نہیں غزلِ مسلسل ہوں۔ یہ دراصل غزل گو شاعروں کے موڈ کا اپنے انداز اور زاویے سے اظہار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعر نظم نہیں کہتا اور غیر ارادی طور پر اس نے غزلِ مسلسل کہہ دی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزلِ مسلسل کا شاعر یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غزل کہہ رہا ہے اور ایک ہی موضوع پر اشعار وارد ہورہے ہیں وہ غزلِ مسلسل کہتا جاتا ہے۔ اس میں یہ صحیح ہے کہ نظم کی کیفیت اور تسلسل جیسی چیز ہوتی ہے۔ اگر ذرا غور کریں تو علانیہ نظم اور غزلِ مسلسل ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے۔ اس طرح غزلِ مسلسل غزل ہوتے ہوئے بھی ایک جداگانہ صِنف کہی جانے کے لائق ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں آزاد غزل اور نثری غزل بلکہ ماہیہ غزل بھی لکھی جانے لگی ہے، غزلِ مسلسل بھی اسی طرح اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اردو میں پچھلی چار پانچ چھ دہائیوں سے آزاد غزل لکھی جانے لگی ہے، دو ایک دہائیوں سے نثری غزل اور اب ماہیہ غزلیں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن آج تک نہ تو آزاد غزل ہی اپنا کوئی تشخص پیدا کرسکی ہے اور نہ نثری اور نہ ماہیہ غزل کو کوئی مرتبت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے برعکس غزلِ مسلسل آج سے نہیں اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دور سے کہی جاتی ہے اور ہمارے اس دور تک کم و بیش ہر شاعر نے غزلِ مسلسل کہی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ غزلِ مسلسل ایک علاحدہ اور نظم سے قطعی جدا باوقار صِنف ہے۔ اس خصوص میں

غزل کے بارے میں جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں انتشار خیالی پائی جاتی ہے ان کے لیے بھی جواب ہے کہ غزلِ مسلسل غزل ہوتے ہوئے بھی پراگندگی اور انتشار خیالی سے نہایت دور اور اپنے تمام اشعار میں ایک معنوی ربط کی حامل ہوتی ہے۔ اور تو اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض نظمیں بھی اگر ان کے عنوان کو ہٹا دیا جائے تو وہ غزلِ مسلسل کی تعریف پر پوری اترتی ہیں بلکہ غزلِ مسلسل کہی جاسکتی ہیں۔

ہیئت اور ٹکنیک کے اعتبار سے ظاہری طور پر غزلِ مسلسل کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کا ڈھانچہ اور رنگ و روغن وہی ہے جو غزل کا ہوسکتا ہے یا ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اگر ہم ان زاویوں سے مطالعہ کریں تو غزلِ مسلسل کوئی اجنبی اور تعجب کی چیز دکھائی نہیں دے گی بلکہ یہ بھی غزل کے قبیلے کی بلکہ غزل کی سگی بہن محسوس ہوگی۔ مطلع، حسنِ مطلع، ردیف و قافیہ اور مقطع ہی نہیں غزل کی جو زبان ہوتی ہے جس میں ہم تشبیہات و استعارات محاورات و تلمیحات اور اشارات و کنایات سے کام لیتے ہیں غزلِ غیر مسلسل کی طرح غزلِ مسلسل میں بھی ان ہی سے آب آتی ہے۔ نظموں میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اور سب کچھ ہو مگر شعریت نہیں ہوتی۔ تغزل تو تلاش کرنے سے بھی بیش تر نظموں میں نہیں ملتا۔ اس لیے ہم غزلِ مسلسل کو نظم سے جدا کرتے ہیں۔ غزلِ مسلسل کو اس لیے بھی نظم سے جدا کرتے ہیں کہ اس میں غزلِ غیر مسلسل کی طرح شعریت بھی ہوتی ہے، سرشاری بھی اور تغزل بھی جو غزل کی جان کہے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک موضوعاتی سطح کا تعلق ہے غزلِ مسلسل میں ایک موضوع ضرور ہوتا ہے لیکن شاعر کا رویہ نظم گو شاعر کے مقابلے میں بدلا ہوا کیوں کہ اس کو بہر کیف غزل کے فنی رموز و آداب کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ہم لاکھ کہہ لیں کہ غزلِ مسلسل نظم ہوتی ہے لیکن غزلِ مسلسل کہنے والا شاعر نظم کے آداب و اطوار سے دور غزل کی دنیا ہی میں سانس لیتا اور غزل گو شاعر کے شیوہ و شعار سے اپنے آپ کو دور نہیں پاتا۔ وہ غزلِ مسلسل کہتے ہوئے بھی غزل کی دنیا میں زیست کرتا اور انہی راہوں پر آگے بڑھتا ہے جن پر غزلِ غیر مسلسل کے بھی نقش قدم ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ غزلِ مسلسل میں داخلی ارتباط بھی ہوتا ہے۔ معنوی تسلسل بھی اور مفہوم کا ارتقاء بھی، جن سے غزلِ غیر مسلسل عاری ہوتی ہے اور قطعی بات تو یہ کہ غزلِ مسلسل نظم جیسی ہونے کے باوجود غزل کی تقریباً تمام خوبیوں سے متصف ہوتی

ہے جس میں تغزل کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ غزلِ مسلسل پر اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں غزل کی خوبیاں اتنی نہیں پائی جاتیں اور جس طرح ہم غزل کے اشعار سے بے تکلفی برتتے ہیں اور غزل کے اشعار یاد رہتے اور زندگی کے ہر موڑ اور موقع پر یاد آتے اور بر محل چسپاں ہوتے ہیں، غزلِ مسلسل کے اشعار میں یہ خوبی نہیں پائی جاتی۔ یہ بات قابلِ غور ضرور ہے لیکن قابلِ قبول اس لیے نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک جتنی بھی غزلِ مسلسل لکھی گئی ہیں ان کے بیش تر اشعار ایسے ہیں جو ہماری نوکِ زباں پر ہیں اور مختلف موقعوں پر ان کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ یہاں غزلِ مسلسل کے تعلق سے ایک بات یہ ضرور ہے کہ ٹھیٹ غزل گو شاعروں کی بجائے ہمارے نظم گو شاعروں نے زیادہ تر غزلِ مسلسل کہی ہے۔ اس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ نظم گو شاعر داخلی اور خارجی طور پر ایک لَے اور ایک انداز میں نظم کہنے کا عادی ہوتا ہے اور اگر وہ اپنی بات کو غزل کے پیرائے میں کہنا چاہے تو ظاہر ہے غزلِ غیر مسلسل میں اپنی بات کہاں کہہ پائے گا۔ اس کو تو اپنے مزاج کی وجہ سے غیر ارادی طور ہی پر غزلِ مسلسل کے سانچے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں بہ طور مثال کئی شاعروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نظم مزاج شاعر ہے چناں چہ اس نے غزلیں بھی کہی ہیں تو بیش تر غزلیں نظم کی صورت یعنی غزلِ مسلسل ہو گئی ہیں۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہو گا۔ آنے والے باب میں اس سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح عصرِ حاضر کے اہم ترین شاعر اقبال بھی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام خصوصاً بالِ جبرئیل کی غزلوں کا جائزہ لیں تو کئی غزلیں غزلِ مسلسل کی تعریف میں آئیں گی۔ مثلاً یہ غزلیں جن کے مطلعے ہیں:

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا !
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا !

❄

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

یہی حال کئی نظم گو شاعروں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے جنھوں نے غزلیں تو لکھی ہیں لیکن ہیئت اور تکنک کے اعتبار سے وہ غزلِ مسلسل کہلانے کی مستحق ہو گئی ہیں۔

ہمارے شاعر خواہ وہ غزل گو ہوں کہ نہیں، بنیادی طور پر غزل مزاج ضرور ہیں اور غزل کی ہیئت اور تکنیک پر وہ کچھ اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے کسی فنی پہلو سے بھی ان کے ہاں گریز نہیں پایا جاتا۔ غزل گو شاعر تو غزل کی تکنیک سے انحراف کرنا چاہیں بھی تو شاید انحراف نہ کر سکیں۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت جس فضا اور ماحول میں پروان چڑھی ہے اس میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ غزل کی اساس کو نظر انداز کیا جائے۔ ایسے غزل گو شاعر غزلِ غیر مسلسل سے انحراف کر بھی لیں اور کسی ایک موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہیں تو ان کی دوڑ غزلِ مسلسل سے آگے ممکن نہیں۔ وہ شاید ایسا کر بھی نہ سکیں۔ اس لیے کہ غزل کی روایات، اس کا مزاج اور اس کا کردار ان شاعروں کے ذہن و دل میں ایسے رچے بسے ہیں کہ وہ غزل کی لکشمن ریکھا کو پار بھی نہیں کر سکتے۔ نظم کی بات اور ہے۔ غزل میں تو آپ غزلِ غیر مسلسل اور غزلِ مسلسل کی ہیئتیں ہی اپنے سامنے رکھتے ہیں (یہ اور بات ہے کہ اب تو آزاد غزل اور نثری غزل بھی لکھی جا رہی ہے۔) برخلاف اس کے نظم گو شاعر کے سامنے کئی راہیں وا اور کئی وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ نظم، نظمِ آزاد، نظم معرا، طویل نظم، مختصر نظم، مثنوی اور ایسی ہی دیگر ہیئتوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ ایک اور بات یہ کہ نظم میں خیالات کا تسلسل اور ارتکازِ خیال بنیادی طور پر ضروری ہے۔ شاعر کتنا بھی انحراف کرے نظم کہتے ہوئے وہ ان فنی پابندیوں سے احتراز نہیں کر سکتا۔ جب کہ غزل گو شاعر ان تحدیدات کا پابند نہیں ہوتا۔

غزلِ مسلسل کی ہیئت ایک اور زاویے سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں شاعر فنی طور پر غزل کہتے ہوئے غزل ہی کہنے پر مجبور ہے۔ انحراف اور گریز کے باوصف وہ غزل کے چوکھٹے سے فرار نہیں ہو سکتا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے کلاسیکل شاعروں ہی نے نہیں ایک عرصے تک ہمارے تقریباً تمام شاعروں نے غزل ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کلاسیکل شاعری کا بڑا اور قابلِ فخر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے، نظم پر نہیں۔ ولی، سراج، میر، مصحفی، غالب، ناسخ، مومن، ظفر، ذوق، انشاء، شیفتہ، میر مہدی مجروح، شاہ نصیر،

یہ سارے شاعر غزل گو شاعر ہیں اور اپنی غزلیات کی وجہ ہی سے اردو شاعری میں ان کا نام جگمگاتا ہے۔ انھوں نے اور اصناف میں بھی تھوڑی بہت طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا وقار اور اعتبار ان کی غزل ہی کے باعث ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ غزل کی ہیئت ان کے اعصاب پر سوار رہی ہے۔

غزل کی ہیئت پر اعتراض کرنے والوں نے طرح طرح کی باتیں کی ہیں۔ اس کو وحشی صنفِ سخن بھی قرار دیا گیا۔ گردن زدنی بھی سمجھا گیا اور ریزہ خیالی اور پریشان خیالی کا مظہر بھی۔ جوش ملیح آبادی نے بھی صنفِ غزل کی مخالفت کی ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

"جوش صاحب نے صنفِ غزل کی جو مخالفت کی ہے، وہ ہماری زندگی کے ایک عام باغیانہ رجحان کا نتیجہ بھی ہے، جس کے زیرِ اثر ماضی کی ہر چیز کو لایعنی سمجھ لیا گیا ہے۔ جوش صاحب کے نزدیک بھی غزل ایک ایسی ہی صنفِ سخن ہے۔ جوش صاحب کی مخالفت میں یہ جذبہ شامل ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ان کی اس مخالفت کا محرک ہوا ہے کہ غزل کی صنف شاعری کو تقلید اور نقالی کی سرحدوں میں داخل کردیتی ہے۔ اس میں شاعر قافیہ پیمائی کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں شاعری کا بنیادی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کے خیال میں ایسی صنف کو ختم کردینا چاہیے۔"

|(غزل اور مطالعہء غزل" مصنف ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص:۱۴۔
ناشر: انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ سنہ اشاعت: ستمبر ۱۹۵۵ء)|

جوش نے بنیادی طور پر غزل میں قافیہ پیمائی کو نشانہ بنایا ہے یہ کہنا غلط ہے کہ قافیہ پیمائی کے نتیجے میں شاعری کا بنیادی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہ اعتراض تو نظم کی ہئیت پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور تو اور خود جوش کے یہاں بھی کئی نظمیں الفاظ کی دھماچوکڑی کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک طرف قافیہ پیمائی بھی غزلوں کی طرح نظموں کے کردار کو بھی مجروح کردیتی ہے تو دوسری طرف ہمارے شاعروں کی سیکڑوں غزلیں ایسی ہیں جن میں قافیہ پیمائی حسن بن کر نکھرتی ہے۔ غزلِ غیر مسلسل ہو کہ غزلِ مسلسل ان دونوں پر قافیہ پیمائی

وغیرہ کے تعلق سے جوش کے یہ اعتراضات رد ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جوش نے غزل کی ہیئت کو کم اور موضوعات کو زیادہ نشانہ بنایا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں:

رنگ و بو آب و نمک نور و ضیا کچھ بھی نہیں
چند نرم و گرم غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا نازنیں
نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں
یہ فقط رسمی مقلّد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
ان کی سیرت ہے انوکھی ان کی غیرت ہے عجیب
گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب و جد کے رقیب
آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیبِ روسیاہ
کرچکا ہے زندگی جو میر، مومن کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے ہر صدا
ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پر تھا
ان کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب سے
" چور آیا "، " چور آیا " کہہ رہا ہو چونک کے
ان کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہے جن لوگوں کی باگ

[''غزل اور مطالعہ غزل'' مصنف: ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص: ۱۵۰۔
ناشر: انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ سنہ اشاعت: ستمبر ۱۹۵۵ء]

ظاہر ہے موضوعات کے تعلق سے غزل پر اعتراضات ایک حد تک درست سہی لیکن ایسے اعتراضات تو بے شمار مثنویوں، قصائد، قطعات اور کئی نظموں پر عائد کیے جاسکتے ہیں۔

غزل پر اعتراض کرنے والوں میں کلیم الدین احمد کا نام بھی نمایاں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل انتشارِ خیال کی مظہر ہوتی ہے اور ہر شعر الگ الگ موضوع پر ہونے کی وجہ سے غزل پڑھنے سے کوئی مجموعی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ کلیم الدین احمد نے لکھا ہے:

"غزل میں صوری حسن کالعدم ہے اور صورت کا احساس ایک دھوکا ہے۔۔۔ وہ، حسنِ صورت، جو نظم، افسانہ، ڈراما وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے، غزل میں موجود نہیں۔ غزل کے ہر شعر میں کسی مخصوص جذبے یا خیال کا اظہار مدِّ نظر ہوتا ہے۔ سارے احساسات و تصورات مرتب و مرکب ہوکر ایک نقشِ کامل کی شکل میں جلوہ گر نہیں ہوتے۔ فنی نقص کی وجہ سے ہر احساس یا خیال اور اس کا وجود، اس کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہی اس کے نیم وحشی ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا احتمال ہے جسے رفع کردینا مناسب ہے۔ یہ بات تو ثابت ہوچکی کہ غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر غزل گو شاعر بھی نیم وحشی ہے۔ ممکن ہے کہ غزل گو شاعر نے اپنے جذبات کی ترتیب و تہذیب کی ہو اور وہ جذباتی و دماغی توازن کا حامل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مہذب ہو لیکن جب وہ صنفِ غزل میں اس کے مخصوص اوصاف کو قائم رکھتے ہوئے طبع آزما ہوگا تو نتیجہ ایک نیم وحشی کارنامہ ہوگا۔ غزل اس الزام سے اسی وقت بری ہوگی جب یہ غزل باقی نہ رہے اور نظم کی صورت اختیار کرلے۔"

[غزل اور مطالعہ غزل" مصنف ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص:۱۸-۲۰
ناشر: انجمن ترقی اردو- پاکستان- سن اشاعت: ستمبر ۱۹۵۵ء]

غزل کے ہر شعر میں جداگانہ موضوع اور انتشارِ خیال کی بات کے سلسلے میں یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ یہ

اعتراضات تو غزلِ غیر مسلسل پر درست ثابت ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزلِ مسلسل ان اعتراضات کی زد میں نہیں آتی۔ غزلِ مسلسل اور غزلِ غیر مسلسل کی ہیئت ایک دوسرے سے کتنی ہی مماثل اور یکساں ہو۔ بہر کیف غزلِ مسلسل میں موضوع کی یکسانیت اور خیال کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ جب یہ بات طے ہے کہ غزلِ مسلسل میں انتشار خیالی اور پریشان فکری نہیں ہے۔ یقیناً اس کو نہ تو وحشی صنف قرار دینا چاہیے اور نہ یہ گردن زدنی ہوسکتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے غالباً اس زاویے سے غزلِ مسلسل کا مطالعہ نہیں کیا۔ انھوں نے عمومی طور پر غزل کا جائزہ تو لیا اور اس کے بارے میں برا بھلا بہت کچھ کہا۔ لیکن لگتا ہے ان کے پیشِ نظر صرف غزلِ غیر مسلسل رہی اور غزلِ مسلسل کو انھوں نے غالباً ارادتاً یا غیرارادتاً نظرانداز کردیا۔ غزلِ مسلسل غزل ہوتے ہوئے بھی ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے غزلِ غیر مسلسل سے یکسر مختلف ہے۔ جیسا کہ واضح ہوچکا ہے، مطلع، مقطع، ردیف اور قافیے وغیرہ کی مماثلت کے باوجود غزلِ مسلسل کا پیمانہ غزلِ غیر مسلسل کے پیمانے سے بہ غایت جدا ہے۔ غزلِ مسلسل کا مطالعہ کرنے والوں کو ان نکات سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ ہیئت اور تکنیک کا جہاں تک تعلق ہے غزلِ مسلسل اپنا اعتبار رکھتی ہی ہے۔ لیکن اپنے موضوع کے زاویے سے یہ غزل ہوتے ہوئے بھی غزل نہیں کہی جاسکتی۔ اسی طرح موضوع کی یکسانیت اور خیال کے تسلسل کے باوصف یہ نظم سے مماثل ہوتے ہوئے بھی نظم نہیں بلکہ یہ غزلِ مسلسل ہے اور صرف غزلِ مسلسل۔

○●○

(باب: تین)

غزلِ مسلسل دکن میں

◆◆◆

(الف) غزلِ مسلسل دبستانِ گولکنڈہ میں

یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تخلیق ادب کا آغاز شمالی ہند سے پہلے دکن میں ہوا۔ دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام سنہ ۱۳۴۷ء مطابق ۷۴۸ھ میں عمل میں آیا۔ بہمنی سلاطین نے شمالی ہند کے حکمرانوں کے تسلط سے نہ صرف ملکی اور سیاسی سطح پر آزادی حاصل کی بلکہ شمال سے اپنے آپ کو ممیز اور مختلف رکھنے کے لیے انھوں نے شمالی ہند کے حکم رانوں کی ہند ایرانی تہذیب کے مقابلے میں اپنی سلطنت میں دکنی تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اہل شمال کے برخلاف ان حکم رانوں نے فارسی کو درباری زبان تو برقرار رکھا لیکن اس کے ساتھ انھوں نے دکنی زبان کی بڑی سرپرستی کی۔ چناں چہ اردو کے اولین ادبی کارنامے بہمنی سلطنت ہی کی دین ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں مثنوی کدم پدم راؤ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی کے علاوہ بہمنی عہد میں غزل کا بھی رواج ہوا۔ ان اولین غزل گو شعرا میں مشتاق بیدری، لطفی، فیروز، قریشی اور حافظ دکنی وغیرہ اہم ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں سیاسی، تاریخی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی تھا جو بہمنی حکومت کا ایک صوبہ دار تھا۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے

انتقال کے بعد ۹۲۴ھ میں سلطان قلی نے اپنے صوبہ تلنگانہ میں خود مختاری کا اعلان کیا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ گولکنڈہ پر اس خاندان کے آٹھ بادشاہوں نے کم و بیش دو سو سال حکومت کی۔ قطب شاہی سلاطین خود بھی صاحبِ علم تھے اور علوم و فنون کے قدر دان بھی۔ انھوں نے اپنی سلطنت میں فنونِ لطیفہ اور تہذیب و تمدن کی بڑی سرپرستی کی۔ ان کے دربار میں علماء و فضلاء، اہلِ علم اور اہلِ ہنر اور اربابِ سخن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا کرتے تھے۔ اس خاندان کے آخری چار بادشاہوں کے بارے میں متحقق طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سخن ور تھے اور انھوں نے دکنی زبان میں شاعری کی۔ خصوصاً قطب شاہی خاندان کا پانچواں حکم راں اور شہر حیدرآباد کا بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے حوالے سے اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان غزل گو شاعر جانا جاتا ہے۔ اس کے کلیات کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں غزلِ غیر مسلسل تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزلِ مسلسل کے اس قدر کثیر نمونے ملتے ہیں کہ اردو غزل کی تاریخ میں شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں ملتے ہوں۔

غزلِ مسلسل کی ہیئت اور ٹکنیک وغیرہ کی صراحت کے بعد جب ہم اردو شاعری میں غزلِ مسلسل کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے دبستانِ گول کنڈہ پر پڑتی ہے۔

غزلِ مسلسل ایسی کوئی قطعی جداگانہ صنف نہیں ہے کہ اس کے آغاز و ارتقا کی نشان دہی کی جائے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہمارے ابتدائی دور کے غزل گو شاعروں کے ہاں غزلِ مسلسل کے خاصے نمونے مل جاتے ہیں، بعض کے ہاں کم تو بعض کے ہاں زیادہ۔ دکنی شاعری کئی زاویوں سے امتیازی اور انفرادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے ہم دکنی کو صرف لسانی اور تاریخی اہمیت دیتے ہیں لیکن دکنی کا سیر حاصل جائزہ لیں تو اس کی ادبی قدر و قیمت بھی کسی سے کم نہیں۔ دکنی شاعروں کے دیوان اور کلیات موجود ہیں جن میں انھوں نے شاید ہی کوئی صنفِ سخن ہوگی جس کو نظر انداز کیا ہو۔ غزلِ مسلسل کو بھی ہمارے دکنی شاعروں نے آزمایا ہے اور بعض کے ہاں تو نہایت دل کش اور عمدہ غزل ہائے مسلسل ملتی ہیں۔ اردو کے پہلے

صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں جہاں باعثِ کشش کئی چیزیں ہیں غزلِ مسلسل بھی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ میں کئی ایک تخلیقات ایسی ہیں جن کو کوئی نہ کوئی عنوان دیے جانے کی وجہ سے یہ نظم محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو ایسی کئی نظمیں نظمیں نہیں بلکہ غزل قرار دیے جانے کی مستحق ہیں۔ اس قسم کی تمام نظمیں دراصل غزلِ مسلسل ہیں۔ چناں چہ پروفیسر مسعود حسین خاں رقم طراز ہیں۔

"محمد قلی کی نظمیں ہیئت کے اعتبار سے غزلیں ہیں۔ محمد قلی نے انھیں غزل ہی کے نام سے یاد کیا ہے لیکن انھیں مرتبین (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر سیدہ جعفر) نے ردیف وار دیوان میں شامل نہیں کیا ہے۔ چوں کہ تسلسل اور موضوع کے اعتبار سے انھیں نظمیں گردانا جاسکتا ہے اس لیے ڈاکٹر زور (اور ان کے تتبع میں بعد کو سیدہ جعفر نے بھی) انھیں عنوانات دے کر کلیات کا پہلا حصہ بنا دیا ہے۔"

[پروفیسر مسعود حسین خاں - محمد قلی قطب شاہ - دہلی - ۱۹۸۱ء - ص: ۳۵]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیاتِ قلی میں شامل تمام نظموں کو پروفیسر مسعود حسین خاں غزل سمجھتے ہیں لیکن یہ عام غزل کی طرح ریزہ خیالی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ غزلِ مسلسل ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

"غزل اس کی (محمد قلی کی) محبوب صنف سخن بن گئی یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ہم نظم کہتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت لکھی ہوئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔"

[ڈاکٹر محمد علی اثر - دکنی غزل کی نشو و نما۔
ص: ۱۲۵ - سنہ اشاعت اول - مقام: ۱۹۸۶ء حیدرآباد]

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ سے ذیل کی نظم دیکھیے جو "بسنت" کے عنوان کے تحت درج ہے۔

4

واضح رہے کہ یہ عنوان محمد قلی کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ مرتبین کا اضافہ ہے ورنہ یہ حقیقت میں غزلِ مسلسل ہے جس میں محمد قلی نے بسنت کے تہوار کی رنگینیوں کا ذکر کیا ہے۔

بسنت

بسنت کھیلیں عشق کا آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نچھل کندن کے تاراں انگ چھونا
بندی ہوں چھند ہندسوں کر سنگارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسمان رنگِ شفق پایا ہے سارا
شفق رنگ جھیسنے میں تارے تگٹ جوں
سرج کرنا نمن زرتار تارا
پیا پگ پڑ ملا کر لیائی پیاری
بسنت کھیل ہور رنگ رنگ سنگارا
جوبن کے حوض خانے رنگ مدن بھر
سو روما روم چرکیاں لائے دھارا
بھگی چولی میں بھیٹن رِنس نشانی
عجب سورج ہے کیوں کر رِنس کوں ٹھارا
بسنت ونت چھند سو کند گال اوپر
پھولایا آگ کیسر کی بہارا

نبیٔ صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رہیا تر لوک سارا

["کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر۔

ص ۳۷۰- سنہ اشاعت: ۱۹۸۵ء -ناشر: ترقی اردو بیورو- نئی دہلی

سلسلہ مطبوعات- ترقی بیورو نمبر ۴۳۷-]

غزلِ مسلسل کے ضمن میں کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر) سے غزل نمبر (۴۰) دیکھی جائے تو اندازہ ہوگا کہ قلی قطب شاہ کو غزلِ مسلسل کہنے پر کتنی قدرت حاصل تھی غزل درجِ ذیل ہے۔

❄

مدن مست بدن مست کجن مست کنچن مست پری مست
ہوئی مست پون مست لگن مست پری مست
چڑی مست سہی مست ڈولی مست رہی مست
کھا مست سرا مست سہن مست پری مست
کھڑی مست انچل مست ڈھلی مست اور ہی مست
گزک مست نقل مست بچن مست پری مست
پری مست پیون مست سرا مست ہوی مست
ملی مست کھچی مست رسن مست پری مست
کھُپا مست پھلاں مست کچل مست کھلی مست
لٹاں مست نین مست دیکھن مست پری مست
تلا مست طرا مست دھری مست دھڑی مست
شکر مست چمن مست ہنسن مست پری مست

چولی مست کھلی مست کنول مست بھنور مست
قطب مست کری مست یون مست پری مست

["کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔

ص: ۵۰۸ - سنہ اشاعت: ۱۹۸۵ء - ناشر: ترقی اردو بیورو - نئی دہلی]

قلی قطب شاہ نے اس غزل میں اپنی محبوبہ کے ناز و انداز اس کی مستیوں ، انداز اور اداؤں اور شیفتگیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لفظ مست کی تکرار سے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ ہر ایک مصرعے میں چار چار مرتبہ لفظ مست کا استعمال غزل کی ساری فضا کو گویا مستیوں سے بھر دیتا ہے۔ لفظ مست کے استعمال سے جو فضا تخلیق کی گئی ہے اس میں بہ تدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے اور بعد کا تسلسل اس غزل کو غزلِ مسلسل کی صورت دے دیتا ہے۔ شاعر کو لفظ مست کی تکرار کچھ اتنی مرغوب ہے کہ اس کو مدن مست ، یون مست ، اور ڈولی ہی مست دکھائی نہیں دیتے گزک اور نقل بھی مست دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ کنول اور بھنور بھی مست کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ مقطع میں تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ قطب بھی مست ہو جاتا ہے۔ قطب شاہ یہاں لفظ مست کو اعضائے بدن ہی کے لیے نہیں بلکہ کھانے پینے کی اشیا ، فضا ، ماحول ، لباس اور کہیں کہیں تو غیر مرئی چیزوں کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ غزلِ مسلسل کے زاویے سے کوئی شبہ نہیں کہ یہ غزل خاصی دل کش محسوس ہوتی ہے۔

کلیاتِ قلی قطب شاہ کی ایک اور غزل یہاں درج کی جاتی ہے جو غزلِ مسلسل کے سلسلے میں خاصی معنیٰ خیز ہے۔

❄

پیا سوں رات جاگی ہے سو دستی ہے سو دھن سر خوش
مدن سرخوش ، سین سرخوش ، انجن سرخوش ، نین سرخوش
پیاری پیار سوں پی ہے پیالا پیم کا تو ہے
دہن سرخوش ، دسن سرخوش ، رتن سرخوش ، بچن سرخوش

نین متوالی ہو جھلتی پیالی پیم پی پی کر
جوبن سرخوش ہے من سرخوش سو تن سرخوش کرن سرخوش
سکی لٹ سنبلستا تھے بتائے باؤ پر مل تو
چمن سرخوش ہے بن سرخوش سمن سرخوش انگن سرخوش
چڑی ہے نیہہ کی مستی سکی کوں پیو کے سنگ تھے
چرن سرخوش ، چلن سرخوش ، ہلن سرخوش ، ڈلن سرخوش
مدن سولٹ پٹائی سو عجائب کچ ہے چھب دھن کا
ذقن سرخوش ، چومن سرخوش ، لگن سرخوش ہے من سرخوش
نبیؐ صدقے قطب بہوگن رین دن عیش کرنے تھے
یون سرخوش مدن سرخوش جگن سرخوش مکن سرخوش

["کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر۔
ص: ۵۸۶ ۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء ۔ناشر: ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی]

یہاں پر شاعر نے لفظ "سرخوش" سے فائدہ اٹھایا ہے۔ سات اشعار کی اس غزل میں لفظ سرخوش کوئی ۲۹ مرتبہ آتا ہے اور ہر جگہ محبوبہ کے کسی عضوِ جسم، اس کی کسی ادا، اس کی کسی حرکت، اس کی خصوصیت، کسی کیفیت اور کسی جذبے یا احساس کے نمایاں کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ محبوبہ پیا کے ساتھ رات جاگی بھی ہے اس لیے وہ سر تا پا اور اپنی ساری اداؤں کے ساتھ سرخوش، مست اور سرشار ہے، کہیں وہ پریت کا پیالہ پیے ہوئے ہے اور اس کی آنکھیں متوالی ہو چکی ہیں۔ کہیں اس کی زلفیں سنبلستاں کی مثال ہیں اور کہیں پیا کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس پر محبت کا نشہ چھایا ہوا ہے تو کہیں زلفوں کی وجہ سے اس کی چھب نرالی محسوس ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر وہ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ سرخوش ہی سرخوش ہے اور ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ قطب شاہ بھی سرخوش اور بامراد و آباد ہے اور نبی کے صدقے میں دن رات

8

عیش کررہا ہے۔ اس غزلِ مسلسل میں کوئی ارتکازِ فکر محسوس نہ ہوتا ہو لیکن ہر شعر میں بلکہ ہر مصرعے میں سرخوشی کی جداگانہ کیفیت غزل کی ساری فضا کو مست و مستانہ بنا دیتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے غزلوں بالخصوص غزلِ مسلسل میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے کہ خیال کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور زنجیر کی یہ کڑی کہیں بھی ٹوٹنے یا چھوٹنے نہیں پاتی۔ غزلِ مسلسل کے لیے جیسا کہ ضروری ہے ہر شعر کو غزل کا ایسا جزو ہونا چاہیے جس طرح منظر کا کوئی حصہ کہ اگر وہ نہ ہو تو منظر نامکمل بے رنگ اور بے رس محسوس ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے بہ جا طور پر لکھا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ:

"بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعر ہے جس نے غزل کی ہیئت کو بھی نظم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں اس کے کلام میں فردیات کی تلاش بے معنی ہے۔"

| "اردو غزل کے نشتر" مصنف: ڈاکٹر مسعود حسین خان۔
ص: ۲۵-۲۶ - سنہ اشاعت ۳۱۵ء - ناشر: غالب اکیڈمی - نئی دہلی |

قلی قطب شاہ کے ہاں متعدد ایسی غزل ہائے مسلسل ملتی ہیں۔ مثلاً وہ غزلیں جن کے مطلعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

❄

تج مکھ کنول پہ پھرتا ہے بھنورا ہو کر اکاس
دیوے پہ جو پتنگ پھرے بے خبر اکاس

❄

چنچل مکھ تیرا دیکھ ڈھلتا شمع
سو عاشق تیرا ہو کے ڈُلتا شمع

❄

کہیا کہ بوسہ سیتی ہمن تم جوان کرو
کہتے کہ پرت کی بات تمن جیو کا جان کرو

❄

پیا آپی ادھراں منجے دان دے
اپس عاشقاں میں منجے مان دے

❄

سہیلی مدن لال موچت بھاوے
کہ تل تل دل اس چھند پرو داری جاوے

❄

ان کے علاوہ اور کئی ایسی غزلیں مل جائیں گی جو غزلِ مسلسل کی تعریف میں آتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ایک بلند پایہ سخن ور ہے اس کے ساتھ مسلسل غزل کہنے والے شاعر کی حیثیت سے بھی اس کا مقام بہت اونچا نہ سہی خاصا اونچا ضرور ہے۔ حسن و عشق کا مزاج رکھنے کی وجہ سے اس کے ہاں محبوب کی ذات اور اس کے حسن اور اداؤں وغیرہ کے موضوعات زیادہ ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے محمد قلی قطب شاہ کی غزل کے بارے میں لکھا ہے۔

"اس کی غزلیں تغزل سے مملو ہیں۔ عشق اور عاشقی کی روئداد کو نہایت عریاں الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ اس امر کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دردِ دل کا اظہار اشعار میں کیا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں سادگی، صفائی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں لوچ ہے، شگفتگی ہے، کلام پختہ ہے۔"

["دکن میں اردو" مصنف، نصیر الدین ہاشمی۔
ص، ۱۰۰۔ سنہ اشاعت، ۱۹۸۵ء۔ ناشر، ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی]

اس نے دیگر موضوعات پر یوں بھی کم طبع آزمائی کی ہے لیکن اس سے ہٹ کر جہاں تک غزلِ مسلسل کی ہیئت اور تکنک کا سوال ہے محمد قلی قطب شاہ کا مرتبہ دکنی ہی میں کیا مجموعی طور پر اردو کے اور شاعروں میں بھی اونچا اور ممتاز ہے۔

•

دبستانِ گول کنڈہ کا ایک اور ممتاز شاعر سلطان عبداللہ قطب شاہ ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان اگرچہ دست یاب نہیں ہے لیکن جو بھی کلام ہماری دست رس میں ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہ طور شاعر غیر معمولی اونچے مقام کا حامل ہے۔ اس کا مزاج بنیادی طور پر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ حسن و عشق کا متوالا، شراب و شباب کا رسیا اور فطرت کے نظاروں پر قربان سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اپنے اشعار میں جا بہ جا اپنے ذوق و شوق کا اظہار کیا ہے۔ اس کی غزلیں دکنی شاعری میں ایک نئے مزاج کی غمازی کرتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح اس نے بھی جہاں جہاں حسن و عشق کا بیان غزلوں میں کیا ہے وہاں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مربوط نظر آتا ہے گویا اس کی ایسی غزلیں غزلِ مسلسل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ (مرتبہ سید محمد) کے مطالعے سے ایسی کئی غزلیاتِ مسلسل قارئین کو محظوظ کرتی ہیں۔ اس کی ایسی غزلیاتِ مسلسل میں سے ایک غزل درج کی جاتی ہے۔

❄

تج کان کا جھمکتا موتی دو گوشیارا
دستا ہے منج ثریا کا عین جیوں ستارا
چوٹی تری مدھاری چھب سوں سہانہاری
لبدا لے گئی ہماری سدھ چین ایک بارا
تج بھوں جو ہے سج نوں اس نوں پہ جیو ہے اجنوں

گزریا ہے دورِ مجنوں ، یو دور ہے ہمارا
تو چلبلی بٹیا ہے تو جگ میں غل اٹھیا ہے
وو زلف جو چھٹیا ہے مہکار اُٹھیا ہے سارا
چوندھر کھلیں ہیں چمناں گمنا تو تج سوں گمنا
یہ آرزو ہے ہمنا دن رات اے نگارا
مدرس منجے پلانا فرصت یہی ہے آنا
اس جیوں کوں کیا پتیانا یو جیو ہے باو بارا
صدقے نبیؐ کے حالی شا عبدلا وصالی
عاشق ہے تیرا بالی ، ہم جیو کا ہے پیارا

ا " دیوانِ عبداللہ قطب شاہ " مرتبہ، سید محمد - ص، ۲۳ - ۲۵

سنہ اشاعت، ۱۹۵۶ء - ناشر، مجلس اشاعت دکہنی مخطوطات

اور دکن ساہتیہ پرکاش سمیتی کی مشترکہ کمیٹی ا

اس غزلِ مسلسل میں محبوب کے حسن اور اس کے سنگھار کے سوائے کوئی بات نہیں ملتی۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرے کان میں گوشوارے کا موتی چمکتا ہے جو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ستارہ، ثریاّ دمک رہا ہو۔ تیری تین بل والی چوٹی اور تیری ادائیں تجھ کو زیب دیتی ہیں۔ لیکن انھیں اداؤں نے ہمارے دل کے سکھ چین کو لوٹ لیا ہے۔ تیری بھویں دیکھ کر ہم پر وہ کیفیت گزر گئی جو مجنوں پر گزری تھی۔ تیری شوخی اور شرارتوں اور چلبلے پن کا ساری دنیا میں غل اٹھا ہے اور تیری زلف جو آگے بڑھی ہوئی ہے اس کی خوش بو سے سارا جگ مہک اٹھا ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم رات دن اپنے محبوب کے ساتھ چمن چمن گھومتے رہیں۔ اے محبوب یہ فرصت کا وقت ہے، تو ہمیں شراب پلانے آ کیوں کہ اس زندگی کا کیا اعتبار جو غیر یقینی اور بے ثبات ہے۔ آخر میں نبیؐ کے صدقے عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے کہ اے محبوب میں تو تیرا عاشق ہوں اور تو ہماری زندگی کا حاصل اور

پیارا ہے۔ کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ میں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں ایک اور غزل ہے۔

❄

یاری لگی ہے پیاری ناری توں سیج آنا
بھانا توں بھوت کرتی تو کیوں توں دل کو بھانا

ہاں نانچ کرتے لےَ دن ہوکر گئے سہیلی
آناں مرے کنے ٹک کِتّا کرے گی نانا

سہیلیانچ میں سہیلی گر دینے جیو ہوتا
پروا نہیں اقل کی عاشق اہے دوانا

دو ہات بجتی تالی تو تال کا سواد ہے
توں جیونیں لگاتی میں جیو کیوں لگانا

ٹک لگ گلے کہیا تو گھنگھٹ میں منہ چھپالی
الپس میں آپ ہنستی کہنا یو کیا ہے مانا

تج بھوت دیکھتے دھن من کوں سکھیاں سمجھتیاں
لوگاں کی شکتی کو لگ چت آپنا چرانا

عبداللہ بھید دل کا صدقے نبیؐ کہیا نیں
جے کچ چھپانے کا ہے دل میں اسے چھپانا

| "دیوانِ عبداللہ قطب شاہ" مرتبہ، سید محمد۔ ص، ۲۷-۲۸۔
سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء ۔ناشر، مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات
اور دکن ساہتیہ پرکاش سمیتی کی مشترکہ کمیٹی |

اس غزل میں بھی عبداللہ قطب شاہ نے غزلِ مسلسل کے آداب کی پابندی کرتے ہوئے نہایت خوبی

کے ساتھ محبوب سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے اور اپنے جذبات عمدگی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ابتدا سے آخر تک ساری غزل حسن و عشق کی فضا لیے ہوئے ہے۔ محبوب کی نزاکتیں، ادائیں اور حسن کی جلوہ فرمائیاں سارے اشعار میں بکھری ہوئی ہیں۔ شاعر نے بات یوں کی ہے کہ اے میری محبوب مجھے تجھ سے عشق ہے تو میری سیج پر آ، تو جو بہانے بنارہی ہے یہی ادا تو دل کو بھاتی ہے، تیرے انکار کرتے کرتے کئی دن گزر گئے اب تو میرے پاس آجا اور نہیں نہیں کہنے سے گریز کر۔ تیری سہیلیوں میں میں نے تجھ کو اپنا دل دیا ہے کیوں کہ جہاں تک عاشق کا معاملہ ہے اس کو عقل نہیں ہوتی وہ تو دیوانہ ہوتا ہے۔ شاعر یہاں کہتا ہے کہ تالی تو دو ہاتھ سے بجتی ہے اور اسی میں لطف آتا ہے۔ لیکن تو جب دل نہیں لگاتی تو میں کیوں دل لگاؤں۔ ہم نے جب تجھ سے گلے ملنے کہا تو تو نے گھونگھٹ میں منہ چھپالیا اور ہنسنے لگی، آخر اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ تو نے دھن تو بہت دیکھا ہوگا اور من کو بھی، اور یوں دل چرانے کا فن تو نے سیکھا ہے۔ آخر میں عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے کہ میں نے نبیؐ کے صدقے دل کا بھید کسی سے کہا نہیں، جو کچھ چھپانے کا تھا اسے میں نے دل میں چھپائے رکھا ہے۔

پروفیسر محمد علی اثر نے عبداللہ قطب شاہ کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے:

"اظہارِ بیان کی سادگی عبداللہ کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ قدیم اردو کے دوسرے بلند پایہ شاعروں کی طرح عبداللہ کی غزلوں میں بھی سادگیِ بیان، بے ساختگی اور روانی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ اس نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات زندگی کو سیدھی سادی زبان اور رواں پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔"

["دکنی غزل کی نشو و نما" مصنف: ڈاکٹر محمد علی اثر۔ ص: ۶۱۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء۔ ناشر: الیاس ٹریڈرس۔ حیدرآباد۔]

بیش تر دکنی شاعروں کی طرح عبداللہ قطب شاہ کے کلیات میں غزل ہائے مسلسل کئی ملتی ہیں جو فنی اور ادبی دونوں معیارات سے قابلِ توجہ ہیں۔ ایسی غزلوں میں چند ایک کے مطلعے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

❄

میں کیوں کہوں پیاری تجھ کوں کہ توں ہے چندا
سورج تھے توں ہے اگلی چندا ترا ہے بندا

❄

ترے مکھ رنگ تھے رنگ پایا ہے لالہ
ترے بالاں تھے پکڑیا باس بالا

❄

مرگ گرجیا ، سہیلیاں ہو ، الاپو راگ ملہارا
کہ خوش موتیاں کے باران ہو برستے میگھ کے دھارا

❄

گوری تگٹ کی کسوت بھرتن کئی ہے آلا
یا سو راز میں پر بایا ہے یوں اجالا

❄

ان کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ایسی ہیں جو غزلِ مسلسل کی ذیل میں آتی ہیں جن سے عبداللہ قطب شاہ کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

●

غواصی کو گول کنڈے کے ملک الشعرا کی حیثیت سے دکنی شاعری میں نہایت اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ غواصی نے مثنویاں بھی لکھیں لیکن اس کی غزلیں بھی غضب کی ہیں۔ کلیاتِ غواصی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ملک الشعرا کہلانے کا مستحق ہے۔ غواصی کی غزلوں میں دکنی شاعری کی روایت کے مطابق حسن و عشق کے موضوعات بھی ملتے ہیں اور بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ غزل کے فنی اور ادبی تقاضوں کی پاس داری بھی غواصی نے بہ تمام و کمال کی ہے۔ جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے

غواصی کے ہاں ایسی غزلوں کی بھی کمی نہیں اور ایسی غزلیں برائے نام نہیں ۔ان میں معنٰی و مفہوم کی دنیا پنہاں ہوتی ہے ۔ مثلاً درجِ ذیل غزل ملاحظہ ہو۔

❄

نہیں سد منج کوں عالم کی کہ بے سد ہو رہتا ہوں میں
سنی نئیں بات منج کس کی کہ دائم اپ سٹا ہوں میں

کہاں تھا کاں تھے آیا ہوں یو کچ فام نئیں ہوتا
پھراتا تیوں دو پھرتا ہوں رکھے تیوں دوڑتا ہوں میں

تمام اس من منے سیر کتا ہے دو اپچ ہوں کر
نہ کچ یو میں کتا ہوں جیوں کتا دو تیوں کتا ہوں میں

جہاں دو سرد کے نمنے جو کرنے سیر آتا ہے
تو اپنی ذات سوں گل جا کہ پانی ہو بہتا ہوں میں

ازل تھے آ ملیا ہے عشق میری آفرینش میں
رھیا ہوں عشق ہو سب آفرینش سو جتا ہوں میں

خدا تیں آج اے بارے نکو آجل مرے گا نوں
کہ اپنے سوز میں جلنے اگن تھے بھی تتا ہوں میں

نکو کہہ ہور نکو پوچ اے غواصی سد کے باتاں منج
نہیں سد منج کوں عالم کی کہ بے سد ہو رہتا ہوں میں

["کلیاتِ غواصی" مرتبہ :پروفیسر محمد بن عمر - ص: ۵۰۸ -

سنہ اشاعت : ۱۹۵۹ء - ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو -حیدرآباد]

اس غزل میں غواصی نے بات یوں شروع کی ہے کہ مجھ کو دنیا کی کیا خبر کہ میں تو بے خبر رہتا ہوں

دنیا کی بات میں کب سنتا ہوں کیوں کہ ہمیشہ ہی بے چین سا خود کو پاتا ہوں اور آگے چل کر وہ بات یوں بڑھاتا ہے کہ میں کہاں تھا کہاں سے آیا ہوں اس کی مجھے کوئی خبر نہیں جس طرح پھرانے والا مجھے پھراتا ہے میں اسی طرح دوڑتا رہتا ہوں۔ میرے دل میں صرف وہی بسا ہوا ہے اور جیسے وہ کہتا ہے میں اسی طرح کہتا جاتا ہوں۔ وہ جو سیر کرنے آیا تھا میں بھی اپنی ذات کو ختم کر کے پانی کی طرح بہہ جاتا ہوں۔ میری فطرت میں ازل سے عشق کی کارفرمائی ہے اور میں عشق کو اپنی فطرت میں بسا چکا ہوں۔ میں اپنی آگ میں آپ جل رہا ہوں مجھے کسی کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اے غواصی مجھ سے عقل اور سمجھ کی باتیں مت کر کیوں کہ مجھ کو دنیا کی کوئی خبر نہیں، میں تو بے خبر سا رہتا ہوں۔

غواصی کی شاعرانہ عظمت کو پروفیسر محمد علی اثر یوں نمایاں کرتے ہیں۔

"جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی، دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ غزل کے میدان میں قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی غزل میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔"

["دکنی غزل کی نشو و نما" مصنف، ڈاکٹر محمد علی اثر۔
ص، ۱۸۶۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء۔ ناشر، الیاس ٹریڈرس۔ حیدرآباد۔]

غواصی کی یہ غزل جس طرح معنویت سے بھرپور ہے دیگر غزل ہائے مسلسل میں بھی اس کی فن کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ غواصی کی ایک اور غزل پیش ہے۔

❄

یکیلا نیند کڑوی کر جو میں ہر رات پھرتا ہوں
بکھیر انجھواں کے تاریاں کوں چندر کی دھات پھرتا ہوں
گھڑی کوں دل گھڑی کوں جیو یو دونوں کھینچتے وودھر

قرار یک تل نئیں منج کوں کہ ہاتے ہات پھرتا ہوں
ادکھ سو رات لیلی کی کیا تو کیا ہوا مجنوں
کہ میں اس تھے بی تج تئیں زیاست کر سو رات پھرتا ہوں
مبادا بات کیں میرے پرت کی پھٹ پڑے گی کر
گنگا ہو جیب کوں گردان سٹ دے بات پھرتا ہوں
نپٹ گرم آہ کے بارے تھے دبلے اس تنک تن سوں
زمیں نرتل اپر ہو جیوں جھڑیا سوں بات پھرتا ہوں
برہ تھے ادموا ہوکر رھیا تو کیا ہوا یوں میں
کہ باطن میں رگے رگ جیو ہو سب ذات پھرتا ہوں
غواصی منج دیوانے کوں نہیں ذرہ خبر کچ یو
جو کاں کمتا ہوں کاں اچتا ہوں کس سنگات پھرتا ہوں

["کلیاتِ غواصی" مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر۔ ص: ۱۳۳۔
سنہ اشاعت: ۱۹۵۹ء ۔ ناشر: ادارہ ادبیات اردو ۔حیدرآباد]

اس غزلِ مسلسل میں غواصی نے ہجر کی کیفیات کو مسلسل زاویوں سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنی نیند خراب کرکے ہر رات بے مقصد گھومتا پھرتا ہوں، تاروں کی طرح اپنے آنسوؤں کو بکھیر کر میں چاند کی طرح خلاؤں میں رواں ہوں، میرا دل وقت کو اور وقت دل کو کھینچتے رہتے ہیں۔ مجھے ایک لمحہ قرار نہیں۔ میں بس ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا ہوں۔ شاعر مجنوں سے مخاطب ہے کہ اس نے لیلی کے غم میں اپنی راتیں خراب کیں تو میں بھی اپنے محبوب کے غم میں رات کو پھرتا رہتا ہوں۔ اس اندیشے سے کہ میری محبت کی باتیں لوگوں پر ظاہر نہ ہوجائیں میں گونگا بن کر خاموش رہا کرتا ہوں کہیں آہوں کے باعث میرا دبلا پتلا جسم متاثر نہ ہو میں زمین پر نہایت احتیاط سے گزارا کرتا ہوں۔ محبوب کی جدائی میں اگر میں نے ادھ موا ہوکر زندگی گزاری تو کیا ہوا کہ

درون میں تو میں اپنی ذات کی رگ رگ میں زیست کرتا ہوں۔ آخر میں غواصی اس بات پر اپنی غزل ختم کرتا ہے کہ میں دیوانہ ہوں مجھ کو کہیں کی کوئی خبر نہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کہاں گھومتا ہوں، کہاں رہتا ہوں اور کس کے ساتھ پھرتا ہوں۔

غواصی کے ہاں ایسی اور کئی غزلیں ہیں۔ قابلِ ذکر غزل وہ ہے جس کا مطلع ہے۔

ہمن عاشق دیوانیاں کوں چھپیلے کسوتاں کیا کام
ہمن دبلے فقیراں کوں دنیا ہور دولتاں کیا کام

دبستانِ گولکنڈہ کے اور شاعروں کے ہاں بھی ایسی غزلیں مل جاتی ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں نظم کا تصور عام نہیں تھا۔ غزل اردو شاعری کی جان اور آن تھی اور لگ بھگ ہر شاعر کے ہاں جن میں احمد، عاجز، بلاقی، جنیدی، ابنِ نشاطی، شاہ راجو حسینی اور تاناشاہ کے نام ملتے ہیں غزلیاتِ مسلسل مل جاتی ہیں۔ طوالت کے خیال سے ان کی غزلوں کا جائزہ لینے سے گریز کرتے ہوئے ان کی طرف اشارے کر دینا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔

G.M

(ب) غزلِ مسلسل دبستانِ بیجاپور میں

بہمنی سلطنت کے جانشینوں میں قطب شاہی سلطنت کے ساتھ شعر و ادب کے سلسلے میں اگر کوئی نام لیا جاتا ہے تو وہ عادل شاہیوں کا ہے۔ عادل شاہی سلاطین نہ صرف شعر و ادب کے دل دادہ اور سرپرست تھے بلکہ ان میں سے کئی اعلیٰ درجے کے شاعر بھی رہے ہیں۔ علی عادل شاہ شاہی کا نام ان سب میں ممتاز اور روشن ہے۔ کہنے کو تو دبستانِ دکن کے رشتے سے عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین بڑی حد تک ہم مزاج اور ہم ذوق رہے ہیں لیکن جغرافیائی حالات ان پر کچھ اس طرح اثر انداز رہے کہ ان دونوں دبستان ہائے شعر و ادب کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ گجرات سے قربت کے باعث عادل شاہی سلاطین اور وہاں کے شعروادب پر گجراتی زبان و ادب کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اسی واسطے سے شمالی ہند سے بھی ان کا رشتہ ایک حد تک قریبی رہا اور شمالی ہند کی زبان نے شعر و ادب میں دبستانِ گولکنڈہ کی بہ جائے دبستانِ بیجاپور کو اپنے طور پر قابلِ لحاظ حد تک متاثر کیا ہے۔ یہاں مقابلہ یا موازنہ مقصود نہیں ہے تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں دبستان اپنے اپنے طور پر اردو ادب کا گراں بہا حصہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں تصوف کا رنگ ہے تو کہیں صنفِ مثنوی پر زور ہے تو کہیں صنفِ غزل کا ہمہمہ ہے لیکن مجموعی طور پر یہ

دونوں وزن و وقار کے حامل ہیں۔ عادل شاہی سلاطین نے شعر و ادب کی غیر معمولی سرپرستی کی۔ ان کے دربار سے وابستہ شعرا کے نام اردو شاعری کی تاریخ میں مہکتے اور جگمگاتے رہے ہیں۔ نصرتی، مقیمی، حسن شوقی، ملک خوشنود، ہاشمی اور معظم جیسے قادر الکلام اور استادالمرتبت شاعروں کی وجہ سے دبستانِ بیجاپور کی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔ دبستانِ بیجاپور کے غزل گو شعرا میں علی عادل شاہ ثانی شاہی (۱۰۶۸ھ تا ۱۰۸۳ھ) نہایت ممتاز مقام کا حامل ہے۔ شاہی دکنی زبان کا ایک خوش فکر اور قادرالکلام شاعر گزرا ہے۔ اس نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اس کے کلیات میں قصائد، مثنویات، مخمس، مثمن، رباعی اور گیتوں کے علاوہ غزلیات بھی موجود ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان میں بعض غزلیات غزلِ مسلسل کے دائرے میں آتی ہیں۔ شاہی کی غزل گوئی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر زینت ساجدہ رقم طراز ہیں۔

"شاہی کی غزلوں کے مطالعے سے اس کی قادرالکلامی، اپج، جدت اور فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں جو لکیر پیٹتے ہیں بلکہ ان میں سے ہے جو عام روش سے ہٹ کر اپنے لیے نیا راستہ نکالتے اور فکر و فن کو نئی وسعتیں بخشتے ہیں۔ وہ ہر رنگ میں غزل کہنے پر قادر تھا۔ لیکن اس کے ہر شعر پر اس کی اپنی شخصیت اور انفرادیت کا نقش بہت گہرا ہوتا ہے۔"

["کلیاتِ شاہی" ڈاکٹر زینت ساجدہ۔ مقدمہ۔ ص: ۸۵۔
مقام اور سنہ اشاعت، حیدرآباد۔ ۱۹۶۲ء۔]

غزل کی عجمی روایت کے مطابق شاہی کی غزل حسن و عشق کی واردات کا آئینہ ہے لیکن اس کی غزل میں حدیث دل بری سے زیادہ طلسم فن کی کارفرمائی ہے۔ خاص طور پر وہ غزلیں جو کسی موضوع یا واقعہ پر لکھی گئی ہیں، اپنی مثال آپ ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل کی غزل دیکھیے جو دراصل غزلِ مسلسل ہے۔

❄

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو
یاقوت ہور مرجان میں کوہے رتن برتر کہو

بولے جہاں کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا
تمنا سہاتا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو

بولیا ہوں نت میں فکرتے یو دو رتن کا فرق کر
گر کچ اچھے انصاف تو اس بول کو خوشتر کہو

مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو

یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

[کلیاتِ شاہی یعنی علی عادل شاہ ثانی کا اردو کلام۔ ص۔۳۱۔۳۰۔
مرتبہ۔ زینت ساجدہ۔ سلسلہ مطبوعات حیدرآباد اردو اکادمی۔
مقام اور سنہ اشاعت: حیدرآباد ۱۹۶۲ء۔]

اس غزل میں شاہی نے مختلف ہیرے جواہرات کا ذکر کر کے ان کی شناخت اور پرکھ سے بحث کی ہے۔ اس غزل میں خیال ابتدا سے انتہا تک نہایت مربوط اور مسلسل ہے۔ وہ ساری دنیا کے جواہرات پرکھنے والوں سے پوچھتا ہے کہ رتن کو پرکھنے کا کیا اصول ہے۔ یاقوت اور مرجان میں کون برتر ہے۔ یہ سن کر دنیا بھر کے پارکھی ایک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اے بادشاہ ہم در حقیقت اس ہنر سے واقف نہیں ہیں۔ تم بحر و بر کے بادشاہ ہو، تمھیں یہ ہنر زیب دیتا ہے تمھیں بتاؤ۔ پھر وہ نہایت غور و فکر کے بعد یاقوت اور مرجان کا فرق بتاتا ہے اور کہتا کہ مرجان میں صفائی نہیں ہوتی، یاقوت میں صفائی ہوتی ہے اور جس ذات میں صفائی ہوتی ہے وہی بہتر ہوتی ہے۔ مقطع میں وہ کہتا ہے کہ شاہی نے یاقوت اور مرجان کی غزل لکھی جسے سن کر دنیا بھر کے

شاعروں نے کہا کہ اس کا ہر شعر نہایت اعلیٰ ہے۔

شاہی کے کلیات میں غزلِ مسلسل کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اس نے ایک ہی موضوع پر مسلسل اظہارِ خیال کیا ہے یا پوری غزل میں ایک ہی کیفیت اور ایک ہی فضا کو برقرار رکھا ہے۔ درجِ ذیل غزلِ مسلسل پیش ہے۔

❋

تجھ گال پر نکھ کا نشان دستا ہے مج اس دھات کا
روشن شفق میں جلمگے جیوں چاند پہلی رات کا

تج زلفِ مشکیں دیکھ کر سانپاں تجے ان پان سب
تج لب کیری لالی انگے لالاں نئے سدگات کا

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشاں تج بات کا

ٹکڑ اس کی کا عید سا دستا اچنبھا روپ سوں
تس کیس پر زر آنچل جھلکاٹ ہے شبرات کا

تیرے بچن شیریں انگے شکر دیکھو کھاری لگے
مکھ میں اوچا کاڑی لیا ڈر کر مہیا نابات کا

بدبل پرت کا ماند کر شاہی سوں جب بازی کرے
لیتی بھلا من کا ترنگ رخ لیا رکھے شہ مات کا

[کلیاتِ شاہی یعنی علی عادل شاہ ثانی کا اردو کلام۔ ص ۳۱۔ ۳۵۔
مرتبہ۔ زینت ساجدہ۔ سلسلہ مطبوعات حیدرآباد اردو اکادمی۔
مقام اور سنہ اشاعت، حیدرآباد ۱۹۶۲ء۔]

شاہی نے اس غزلِ مسلسل میں معشوق کے حسن و شباب، تناسب اعضا اور رعنائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے گال پر ناخن کا نشان ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے روشن شفق میں پہلی رات کا چاند جگمگاتا ہے۔ تیری زلفِ مشکیں کو دیکھ کر سانپوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور تیری سرخی لب کے آگے لعل بھی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے ہیں۔ تو جب ابروؤں کی کمان کو کھینچ کر پلک کے تیر چھوڑتا ہے تو ان سے دل کا ہرن زخمی ہو جاتا ہے۔ سکھی کا چہرہ عید جیسا بارونق ہے اور اس کے سر پر زر کے آنچل کی جگمگاہٹ شبِ برات کی طرح روشن ہے۔ اے محبوب تیری میٹھی باتوں کے آگے شکر بھی کھاری لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجھ سے ڈر کر نیشکر نے اپنے منھ میں کاڑی پکڑی ہے۔ جب تو شاہی کے ہوش اڑا کر اس سے بازی کھیلتی ہے تو اس کے دل کا ترنگ اڑا لیتی ہے اور شہ مات کا رخ لا کر دیتی ہے۔

شاہی کے کلیات میں سے حسبِ ذیل غزل بھی غزلِ مسلسل ہے۔

❄

تج بھال کے پرتاب تے پیدا چندر بالا ہوا
سندر گلے میں ہانس تج جیوں چاند کوں بالا ہوا
ناچک چکا دیکھیا ہوں جب بکھرے الک تج سیس پر
مج و شسٹ کوں تج کیس یوں جیوں میں پرجالا ہوا
تج خومے کی خوش باس تو باسی کیے ہیں باس سب
جھٹکے الپس کے بال جو تو بھئیں پہ سب ہالا ہوا
کیسرتے ٹپکا ٹیپ کر ٹیپ کر دیتی مھن جب بھال
دنکر دسے تیلک یو سد ہور مانگ اجیالا ہوا
سو ہے سو رنگ ڈور سے سگل لو چن میں تج تکسیر سے
اس نہن کی تاثیر تے سب گوڑ بنگالا ہوا

منگتے ہیں اکثر نین تج مج دل لجانے کے سبب
پتلیاں دسے بیڈر ہو سد سوگا سو جیوں بھالا ہوا

نیں نیں یو چک سندر تو ہے یو جام ہیں پر مئ بھرے
چاکھیا مگر یو جام تو منصور متوالا ہوا

تیرے ادھر پر لال ہور کالی دھڑی کے رنگ تھے
گنج پھل بھرے ہیں بیل میں ، چمنے چمن لالا ہوا

سارا پنم کا چاند سو تیرے سو لکھن مکھ اگل
کھو کر اپس کا نور سب جیوں روئی کا گالا ہوا

اندر سنواریا آرتی تج مکھ سلونے کے بدل
چند سور دو دیپک دسیں آکاس سو تھالا ہوا

تیری مہن مالے کی چھب دیکھیا ہوں جب چھاتی پہ تج
تج ناؤں سو مج درد کر دو مال جپ مالا ہوا

تج بانہہ پر کنچک ہری ہور ہات میں مھیندی کے گل
سب مل نظر میں یوں دسے جیوں پھول کا ڈالا ہوا

اکثر دسے تیری صفت لیلی بنیے مجنوں کے تئیں
اس تے دیوانہ ہوتیا سب جگ سوں نروالا ہوا

رب سستے مل شاہی نے جب تولیا ہے تیرے حسن کوں
دنڈی دسے سد کہکشاں آکاس سو تھالا ہوا

[کلیاتِ شاہی یعنی علی عادل شاہ ثانی کا اردو کلام۔ ص: ۳۷-۳۸۔
مرتبہ۔ زینت ساجدہ۔ سلسلہ مطبوعات حیدرآباد اردو اکادمی۔

مقام اور سنہ اشاعت: حیدرآباد ۱۹۶۲ء۔ |

اس غزل میں بھی شاہی نے محبوب کا سراپا بیان کیا گیا ہے اور اس کے ایک ایک عضو کے حسن و جمال کی کیفیت پیش کی گئی ہے۔ اس غزل کا مطلع حسنِ جبیں کا مطلع ہے شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے پیشانی کے نور سے چاند کی تخلیق ہوئی اور تیرے گلے میں جو خوب صورت ہنسلی ہے وہ چاند کا ہالہ بنی ہوئی ہے۔ جب تیرے بال بکھرتے ہیں تو مجھے نہ آنکھ دکھائی دیتی ہے نہ تارا۔ تیرے گیسو میری نظر کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے مچھلی کے لیے جال۔ تیرے پسینے کی خوش بو تمام خوش بوؤں نے لی ہے۔ جب تو اپنے بال جھٹکتی ہے تو زمین کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ جب موہن (محبوب) اپنی پیشانی پر زعفران کا ٹیکہ لگاتی ہے تو یہ سورج کی طرح چمکتا ہے جس سے اس کی مانگ روشن ہو جاتی ہے۔ تیری آنکھیں میرا دل چھین کر لے جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پتلیاں خالص شکاری اور پلکیں بھالے کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ تیری آنکھیں بہت حسین ہیں لیکن آنکھیں نہیں بلکہ مے سے بھرے جام ہیں۔ شاید منصور اسی جام کو چکھ کر دیوانہ ہوا۔ تیرے لب کی سرخی اور مسی کی سیاہی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ بیل پر گچھیاں لگی ہیں اور چمن میں ہر طرف گلِ لالہ کھلے ہوئے ہیں۔ تیرے روشن چہرے کے آگے پونم کا چاند بھی ماند پڑ گیا اور روئی کے گالے کی طرح بے نور ہو گیا۔ تیرے سلونے چہرے پر اتارنے کے لیے اندر نے آرتی سنواری اور آسمان کے تھال پر چاند اور سورج کے دو چراغ جلائے۔ اے موہن جب سے میں نے تیرے سینے پر مالے کی چھب دیکھی ہے تب سے وہ مالا میرے لیے تیرا نام جپنے کا مالا بن گیا ہے۔ تیری بانہوں پر ہرے رنگ کی چولی اور تیری ہتھیلیوں پر مہندی کی سرخی یوں معلوم ہو رہی ہے جیسے سبز شاخ پر پھول کھلا ہو۔ تیرے حسن کی صفت لیلیٰ میں تھی جس کی وجہ سے مجنوں دیوانہ ہو کر دنیا میں نرالی حیثیت کا مالک ہو گیا۔ سورج کو سر سے ملا کر جب شاہی نے تیرے حسن کو تولنے کی کوشش کی تو کہکشاں ترازو کی ڈنڈی اور آسمان اس کا تھال محسوس ہونے لگا۔

•

سید میراں ہاشمی بھی ایک ایسے ہی پر گو اور شاعرانہ ہنرمندی کے حامل شاعر تھے۔ ہاشمی کے بارے میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے کچھ زیادہ معلومات بہم نہیں پہنچائی ہیں۔ خود ان کے نام کے بارے میں مختلف محققین نے مختلف باتیں کہی ہیں۔ ہاشمی کے وطن، سنہ پیدائش، ان کی زندگی کے دیگر حالات جیسے ان کا مسلک، ان کے سنہ وفات وغیرہ کے بارے میں بھی بہت کم معلومات ہیں۔ قوی شہادتوں کی روشنی میں بہ قول جمیل جالبی کہا جاسکتا ہے کہ ہاشمی کا انتقال ۱۱۰۹ ہجری کے بعد بیجاپور میں ہوا اور یہی ان کا مدفن ہے۔ ہاشمی نے مثنویاں بھی لکھی ہیں اور نظمیں و غزلیں بھی لیکن ریختی گوئی کی وجہ سے ہاشمی کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ریختی کے لیے عموماً غزل کی ہئیت برتی جاتی ہے۔ چناں چہ ہاشمی کی ریختیاں بھی غزل کی ہیئت میں موجود ہیں۔ یہاں ہاشمی کی ریختی گوئی کا جائزہ لینا مقصود نہیں اور نہ ہی اس کا محل ہے لیکن ایسی غزلوں میں کئی ایسی غزلیں ہیں جن میں ہاشمی نے غزلِ مسلسل کی تکنیک سے کام لیا ہے۔ ہیں تو یہ ریختیاں ہی لیکن غزلِ مسلسل کے پیرائے میں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ہاشمی کے ہاں ریختی موضوعات پر کئی غزل ہائے مسلسل ملتی ہیں ذیل میں دو، ایک غزلوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

پیاسا ہوں میں کئی روز سوں تجھ مہر کے پھل نیر کا
شربت میٹھا لب سوں پیٹھے دے ہر میٹھی تقریر کا

دل خوش ہو آتا ہے ہنسا گوری ترا مکھ دیکھ کر
رنگ زعفراں کا باغ توں مانند لیتی کشمیر کا

جو بن ترے گالاں تھڈی اور جھڑتے دیکھا ہے جو کوئی
ہرگز نہ لے گا ناؤں پھر نارنج، سیب، انجیر کا

کالی دھڑی میں دھن تری بیٹھا ہے میرا جیو سویوں
بیٹھا ہے کرناٹک میں جیوں سکّہ سو عالم گیر کا

تجھ حسن کے بازار میں ہوئیگا اسی کوں لاب کچھ
خرچے گا جیو کا نقد ہور سودا کرے ہر پھیر کا

["دیوانِ ہاشمی" مرتبہ، ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ص: ۲۰۱

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدر آباد۔ ۱۹۶۱ء]

اس غزلِ مسلسل میں حسن و عشق کا وہی روایتی موضوع ہے۔ محبوب کے حسن، اس کے اعضائے بدن اور اس کے انداز، اس کے رنگ ڈھنگ اور اس کی اداؤں کو ہاشمی نے ایک خاص ڈھب اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں کئی روز سے تیری محبت کے پھلوں کے شربت کا پیاسا ہوں، مجھے اپنی میٹھی باتوں سے نواز کہ میں تیرے میٹھے لبوں سے بات سننا چاہتا ہوں اے محبوب تیرا چہرہ دیکھ کر میرا دل خوش ہوجاتا ہے، میں ہنسنے لگتا ہوں گویا میں نے کشمیر کے کسی زعفران کے باغ کا نظارہ کیا ہے۔ میں تیرے رخ تیرے گال اور لب سے اتنا متاثر ہوں کہ ان کو دیکھ کر میں نارنج، سیب و انگور کا نام لینا بھول گیا ہوں۔ میں تیری دھن میں یوں بیٹھا ہوا ہوں کہ اٹھنا محال ہے گویا کرناٹک میں عالم گیر کا سکّہ بیٹھ گیا ہو۔ تیرے حسن کے بازار میں صرف اسی کا فائدہ ہوگا جو اپنی زندگی بیچ کر سودا کرے گا، اپنی ذات کو قربان کرے گا۔ یہ ایک پانچ اشعار پر مشتمل مختصر سی غزل ہے جس میں ہاشمی نے غزلِ مسلسل کا انداز پیدا کرتے ہوئے اپنی فن کارانہ ہنر مندی کو ثابت کردیا ہے۔

ہاشمی کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

اے دل چھبیلی مکھ ترا دیکھا جو انور آفتاب
تو ہر صبا تجھ کن جھلک لیتا ہے منگ کر آفتاب
تیرے نورانی تن اپر چادر مہتابی یوں دسے
جانوں شفق کرناں کی لے اوڑا ہے چادر آفتاب

GM

توں کوٹھری میں کوئی گھڑی بیٹھی تو نئیں دستی لگر
سدسٹ کے بےسد ہو پھرے ڈھنڈتا گھرے گھر آفتاب

تیری جوانی دیکھ کو رشکوں بڈھا ہو کانپتا
باور نہیں تو دیکھ توں پانی میں تھر تھر آفتاب

دھپ کے سنے کا گھر پکڑ باڑا انگن مڑنے کے تیں
نت اٹھ کے آتا ہے سنا ہو کر کے مل کر آفتاب

بیسر تماری ناک میں دیکھیا تو عالم یوں کیا
یا رب یو کیا ہے معجزہ پینا ہے بیسر آفتاب

ماڑی پہ تے جھانکو نکو محشر کا ہویگا غلغلہ
دن ہو کے عالم کیگا یوں آیا ہے بھوئیں پر آفتاب

اچھتی جو توں ظلمات میں سب کاہیکوں ہوتی رنجش
ماباٹ بھلتے ہوں ترا دیکھت سکندر آفتاب

کرناں کے رسرے باندھ کر چھڑ کر گیا اسمان کوں
آتا ریجھا نے ہو تجھے لے لاکھ ڈونگر آفتاب

جائی بنات النعش کی ہر رات کے دے بات میں
جھمکے ثریا کہکشاں بھیجا ہے گلسر آفتاب

مجرے کوں دھن کے ہاشمی جانے کا تیرے کیا عجب
مجرے کوں آتا روز اٹھ ہو دھن کا چاکر آفتاب

["دیوانِ ہاشمی" مرتبہ، ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ص، ۳۹-۴۰
ناشر، ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔ ۱۹۶۱ء]

یہ غزلِ مسلسل ہاشمی کی اور غزلوں کی طرح غیر معمولی دل کشی رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب سورج جو تیرے چہرے کو دیکھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر صبح وہ تجھ سے جھلک مانگ کر روشن ہو رہا ہے۔ تیرے نورانی جسم پر چاندنی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتاب نے شفق کی کرنوں کی چادر بنا کر اوڑھ لی ہے۔ تو اگر اپنے کمرے میں بیٹھی رہے تو تجھے نہیں پاکر آفتاب اپنی سدھ بدھ گنوا دیتا اور تجھ کو گھر گھر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ تیری جوانی دیکھ کر جیسے رشک سے بڈھے کانپتے ہیں اگر تجھے یقین نہ آئے تو پانی میں دیکھ آفتاب کیسا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ دھوپ کے سونے کو لیے، چاردیواری اور آنگن کو منڈنے کے لیے آفتاب تجھ سے مل کر سونا بن جاتا ہے۔ تمھاری ناک میں بیسر دیکھ کر سارا عالم کہتا ہے کہ یارب یہ کیا معجزہ ہے کہ آفتاب بیسر پہنے ہے۔ اے محبوب تو بالاخانے سے مت جھانک کہ اس طرح قیامت برپا ہوجائے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ آفتاب زمین کے قریب آگیا ہے۔ تو اگر ظلمات میں ہوتی تو رنجش کا سوال ہی نہ ہوتا کیوں کہ تیرا آفتاب جیسا چہرہ دیکھ کر سکندر راستہ بھول جاتا ہے۔ کرنوں کی رسیوں سے چڑھ کر آفتاب آسمان پر پہنچ گیا تاکہ تجھے رجھانے کے لیے اپنے ساتھ لاکھ ڈونگر لاسکے۔ اور تو بنات النعش کی جائی ہے اسی لیے ہررات کے ہاتھ سے آفتاب نے ثریا اور کہکشاں کے جھمکے اور گلسر بھیجے ہیں۔ اے ہاشمی مجرے کے لیے تیرے جانے کا کیا جواز ہے، خود آفتاب ہر روز اٹھ کر مجرے کے لیے آتا ہے۔ ہاشمی کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے۔

❄

انو آویں تو پردے سوں گھڑی بھر بھار بیٹھونگی
بہانا کر کے موتیاں کے پروتے ہار بیٹھونگی
اونو یاں آوَ کیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اُٹھلتی اور مٹھلتی چپ گھڑی دوچار بیٹھونگی
نزدیک میں دوڑ جانے کوں خوشی سوں چپ اچھل رہونگی
ولے لوگاں میں دکھلانے کوں ہو بیزار بیٹھونگی

GM

پکڑ کر ہات پردے میں لیجاوینگے تو جھڑکونگی
گھونگھٹ میں مکھ چھپا کر تک میں تڑ کا مار بیٹھونگی
بلایاں جیو کے جیو میں لے پڑونگی پاؤں میں دل سوں
ولے ظاہر میں دکھلانے کوں ہو اغیار بیٹھونگی
کروں گی ظاہر انا چپ غصہ اور مان ہٹ لیکن
سریجن پر تے جی اپنا جیو میں وار بیٹھونگی
سلاوینگے تو ناسونگی اٹھونگی واں تے یوں کہہ کر
چپونوں دا خوشی میری میں ہو ہوشیار بیٹھونگی
کتی بیزاری دیتے دوئی جو بیٹھی تو نزیک اتنے
مجھے سوگند ہے جو آکر یوں دوسری بار بیٹھونگی
کنے کو چپ کتی ہوں میں ولے جی میں گھٹ کئی ہوں
نزیک ہو ہاشمی کے مل میں آٹھوں پہار بیٹھونگی

| "دیوانِ ہاشمی" مرتبہ، ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ص، ۳۳۳۔۳۳۵

ناشر، ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔ ۱۹۶۱ء |

ہاشمی کی اس غزلِ مسلسل کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہاشمی نے ریختی غزل کے ذریعے عورتوں کے مختلف جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑے ہی دل کش انداز میں کی ہے۔ ان غزل ہائے مسلسل میں صنفِ نازک کے بنیادی جذبات و احساسات کو بڑے ہی گہرے نفسیاتی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں سادگی ہے، ایک معصومیت ہے، ایک بھولا پن ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔

دیوانِ ہاشمی میں ایسی اور کئی غزلیں ملتی ہیں، کہیں کہیں ریختی کی صورت میں بھی جن کو پڑھ کر ہاشمی کی فن پر قدرت، حسن و عشق سے غیر معمولی آگہی اور شعر و ادب کی روایات سے ہم آہنگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں ایسی چند غزل ہائے مسلسل کے مطلعے پیش ہیں۔

❄

سجن بن مجھ کوں پونچا ہے دندی اسمان ٹھنڈ کالا
منگیا ہے گھات کرنے کوں اکیلی جان ٹھنڈ کالا

❄

پیا کے پل بچھڑنے سوں یو میں گھر چار چھوڑی ہوں
پڑیا ہے کس کو جترب کا سو میں سنسار چھوڑی ہوں

❄

اتا ساقی ملیں گے تو مرا سب حال بولوں گی
بچھڑ رھی تھی سو جیو میرا ہوا پامال بولوں گی

❄

مجھے پکڑے ہیں کی چھوڑو دیکھو ہوہانک مارونگی
خدا کی سوں میں ہنستی نئ بڑی بو کو پکارونگی

| "دیوانِ ہاشمی" مرتبہ: ڈاکٹر حفیظ قتیل۔
ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔ ۱۹۶۱ء) |

•

بیجاپور کے جن شاعروں نے کم شعری سرمائے کے باوجود دکنی شاعری میں بلند نام پایا ہے ان میں ایک معظم بیجاپوری بھی ہیں۔ معظم بیجاپوری کی چند ایک نظمیں اور قصیدے عام طور پر ملتے ہیں۔ ابوالنصر محمد خالدی نے معظم کے کلام اور اس کے حالاتِ زندگی کے خصوص میں کافی کوشش کی ہے۔ کلامِ معظم بیجاپوری کی اشاعت سے معظم کا کلام تفصیل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ اس سلسلے میں

کہنے کی ضرورت نہیں کہ معظم کی غزلیں بھی عام دکنی غزلوں کی طرح موضوعات کے اعتبار سے روایتی اور زبان کے اعتبار سے بیجاپوری دکنی کا اچھا نمونہ ہیں۔ چوں کہ ان شاعروں نے محبوب کے سراپا اور اس کے انداز اور اداؤں ہی کو اپنی غزلوں میں زیادہ تر پیش کیا ہے اسی لیے بعض غزلوں میں غزلِ مسلسل کی کیفیت ملتی ہے۔ معظم نے نہایت عمدگی کے ساتھ غزلِ مسلسل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزلیں کہیں ہیں۔ مثلاً اس غزل کو غزلِ مسلسل کہا جاسکتا ہے۔

❋

پیارے کی جدائی سے مجھے گھردار نئی بھاتا
نہ مجھ کو کام خوش لگتا سگل سنسار نئی بھاتا
سکیاں سب دل بہلانے کو مرے گفتار ہیں کرتیاں
مٹھیاں باتاں بوریاں لگتیاں سواد گفتار نئی بھاتا
مجھے ابرن پہنے سوں سینے میں آگ لگتی ہے
لگانا تن کو خوش بوئی پھولوں کا ہار نئی بھاتا
رکھی ہوں پوت کالی میں نشانی ہے سہاگن کی
مسی داتوں کو لانا اور یہ سنگار نئی بھاتا
نویلا لال قادر شہ سنگاتی سیج کا میرے
کیا ہے مجھ سے اغیاری کسی کا پیار نئی بھاتا

["کلامِ معظم بیجاپوری" بہ تصحیح و تقدیم: ابو النصر محمد خالدی۔
ص: ۳۲-۳۳۔ سنہ اشاعت: مئی ۱۹۸۵ء۔]

معظم نے یہ غزل ریختی کے پیرائے میں کہی ہے۔ جس میں محبوب کی طرف سے جذباتِ عشق کا اظہار کیا گیا ہے۔ محبوب عاشق سے جدائی کے زمانے کی کیفیات کو نہایت پُراثر اور پُرسوز انداز میں بیان کرتی ہے۔

عاشق کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے اور عالمِ ہجر میں کہیں کوئی دل چسپی محسوس نہیں ہوتی، کوئی بات خوش نہیں آتی، کہیں دل نہیں لگتا اور طبیعت اچاٹ اچاٹ رہتی ہے۔ محبوب کہتی ہے عاشق کی جدائی کی وجہ سے اسے گھر دار اچھا نہیں لگتا نہ کوئی کام اچھا معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی چیز پسند آتی ہے۔ یہاں تک کہ سہلیاں دل بہلانے کے لیے دنیا بھر کی باتیں کرتی ہیں لیکن میٹھی باتیں بھی اچھی معلوم نہیں ہوتی اور نہ اندازِ گفتار پسند آتا ہے۔ مجھے عاشق کی جدائی میں سینے میں آگ لگتی محسوس ہوتی ہے نہ تن کو خوش بو بھاتی ہے اور نہ پھولوں کا ہار پسند آتا ہے۔ میں نے سہاگن کی نشانی سمجھ کر کالی پوت اٹھار کھی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ دانتوں کو مسی لگانا پسند آتا ہے اور نہ کوئی سنگھار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب سے میرے عاشق (قادر شاہ) نے مجھ سے غیروں کا سلوک شروع کیا اور تغافل سے پیش آیا مجھ کو بھی آج تک کسی کا پیار گوارا نہیں ہوا۔

معظم کی یہ غزل ہر چند کہ مختصر سی اور صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے لیکن غزلِ مسلسل کی ہیئت اور ٹکنیک کے اعتبار سے اس کا مقام بہت اونچا ہے اور یہ خاصی مربوط ہے۔ معظم کے ہاں اور جو مسلسل غزلیں ملتی ہیں ان میں سے ایک اور پیش ہے۔

❄

نازک بچن سخن کے اس کا خیال نازک
نازک چرن کنول سے اور اس کی چال نازک
اول سو حسن نازک نازک مزاج سارا
سب سر بسر ملاحت اس کا جمال نازک
نازک بدن ہے اس کا سرتا و پا لطافت
اور چاند سے بدن پر کاکل کے بال نازک
نازک نگاہ اس کا کاں لگ بیاں کروں میں
دستا نئیں تمثل دینے مثال نازک

روشن جبیں پر اس کے نازک ہیں قوسِ ابرو
جیوں ماہِ نو شفق میں دستا ہلال نازک
نازک ہے وقت مجھ پر اور اس کے لب میں امرت
اس کا طبع ہے نازک اور مجھ پہ حال نازک
قادر نے سن کے شعر یہ بولا مجھے معظم
محرم ہے راز سے تو تیرا ہے قال نازک

| "کلامِ معظم بیجاپوری" بہ تصحیح و تقدیم،
ابو النصر محمد خالدی - ص: ۵۷-۵۸ - سنہ اشاعت: مئی ۱۹۸۵ء - |

معظم نے اس غزلِ مسلسل میں محبوب کے حسن اس کی نزاکت اور اس کے انداز و ادا کی دل آویز پیرایہ میں ترجمانی کی ہے۔ ساری غزل پر یہی حسن اور رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ شاعر نے غیر معمولی نزاکت و ہنرمندی کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے میرے محبوب کی باتیں نزاکت لیے ہوئے ہیں اور اس کا خیال بھی نازک ہے۔ اس کے نازک نازک پاؤں کنول جیسے ہیں اور اس کی چال بھی نزاکت لیے ہوئے ہے اول تو نزاکت میں وہ حسن لاجواب اور اس کا مزاج بھی نزاکت لیے ہوئے، اس کی خوب صورتی ملاحت لیے ہونے کی وجہ سے بے مثال ہو جاتی ہے۔ محبوب کا نازک بدن سر سے پیر تک لطافت لیے ہوئے ہے گویا وہ مکمل چاند ہے اور اس چاند سے بدن پر کاکل کے بال نزاکت میں کچھ اور ہی اضافہ کر دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے میں اپنے محبوب کی نازک نگاہ کا بیان کہاں تک کروں کیوں کہ اگر میں مثال بھی دینا چاہوں تو کوئی مثال نہیں ملتی۔ میری محبوب کی پیشانی پر نازک ابرو کے قوس ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے ماہِ نو شفق میں ہو تو نازک نازک دکھائی دیتا ہے۔ میرے محبوب کے لب امرت لیے ہوئے ہیں اور اس کی طبیعت نازک ہے اور میرا عالم ہے کہ یہ دیکھ کر مجھ پر ہی نازک وقت آ پڑا ہے اور میں عجیب صورتِ حال سے دوچار ہوں۔ میرا یہ شعر سن کر قادر نے کہا تو حقیقتوں سے واقف ہے اس لیے تیری باتوں میں

یہ نزاکت پائی جاتی ہے۔ معظم بیجاپوری کے ہاں کچھ اور بھی غزلِ مسلسل ملتی ہیں مثال کے طور پر دو اور غزلِ مسلسل کے مطلعے پیش ہیں۔

❄

اے مالکِ دو عالم افسر تجھے مبارک
لو لاک کا ترے سر چھتر تجھے مبارک

❄

لٹ چھوٹ کے الک پر کیا خوب رہے لٹک
تو عاشقاں سپڑ کر لٹ میں رہے اٹک

["کلامِ معظم بیجاپوری" بہ تصحیح و تقدیم،
ابو النصر محمد خالدی۔ سنہ اشاعت، مئی ۱۹۸۵ء۔]

●

دکنی شاعری خصوصاً دکنی غزل کی تاریخ میں حسن شوقی ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ حسن شوقی غزل کا ایک قادرالکلام سخن ور تھا جس نے اپنے تغزل سے آنے والی کئی نسلوں کو متاثر کیا، چناں چہ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"اس کی غزل، قدیم زبان کے باوجود آج بھی بے کیف و بے اثر نہیں ہے بلکہ سوز و شیرینی کے ملے جلے اثرات دل کے تاروں کو آج بھی مرتعش کرتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں اس اثر کو پیدا کرنے کے لیے شوقی عام طور پر رواں بحروں کا انتخاب کرتا ہے۔"

[ڈاکٹر جمیل جالبی۔ "تاریخ ادب اردو" جلد اول۔
ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ دہلی۔ ص ۱۶۱]

حسن شوقی کی غزلیں روددادِ حسن و عشق کے دل آویز مرقع ہیں۔ حسن شوقی نے اپنی شاعری میں

GMA

حسن کی پرستش کی ہے اور دل و جان سے اپنے محبوب کو چاہا ہے ۔ ان کی غزلوں میں جا بہ جا محبوب کے زلف و گیسو ، لب و رخسار ، خال و خط اور چشم و جبیں کی باتیں ملتی ہیں اور یہاں تک کہ انھوں نے غزلِ مسلسل سے کام لیتے ہوئے اپنے محبوب کے حسن اور اس کے سراپا کی تفصیل تسلسل کے ساتھ بیان کردی ہے ۔ اپنی ایک غزل میں محبوب کی رعنائیوں اور برنائیوں کو بھی انھوں نے ہنرمندی سے منظوم کردیا ہے ۔ تغزل کی چاشنی نے غزلوں کی دل کشی کو کہیں افزوں کردیا ہے ۔ دیوانِ حسن شوقی مرتبہ جمیل جالبی کی پہلی غزل ہی غزلِ مسلسل کے ذیل میں آتی ہے جس میں حسن شوقی نے محبوب کے حُسن کی نہایت فراخ دلی کے ساتھ قصیدہ خوانی کی ہے ۔

❄

تجہ مکہ کنول کنولے بدل جگ میں سو رنگ لالا ہوا
تجہ زلف تھی اپچی بہنور دو جی بہونگ کالا ہوا

تجہ نین تھی نرگس کھلی عبہر کھلی بنکش پھلی
تجہ خوئی تھی دونا ہوا ، مروا ہوا ، بالا ہوا

تجہ بال کالے رات ہور بالا سو کہتے دیس ہے
تجہ بال ہور بالا مگر ہنگام چڑ کالا ہوا

تجہ ناز کے بیداد تھی ویراں ہوا ہے کا نورو
تجہ لب شکر کے قول تھی معمور بنگالا ہوا

افتاں و خیزاں روز و شب تنہا پہروں سنسار میں
جس وقت تھی تجہ نیہہ کا مد پیہہ متوالا ہوا

مجہ جگ پہ جگ چنچل انجھواں تھی یک رتری ہوری
اس عکس کے معکوس سوں نکتے سرنگ مالا ہوا

شوقی ہماری برہ کا آسانِ جیوں جو کہیا فلک
پاسنگ اس میزان کا کاویل ترنالا ہوا

| "دیوانِ حسن شوقی" مرتبہ: جمیل جالبی۔ ص: ۱۲۹۔۱۳۰۔

ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان۔ اشاعت اول ۔ ۱۹۷۱ء۔ |

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ تیرے چہرے کے کنول اپنی مثال آپ ہیں۔ لالا کا تیری زلف سے کیا مقابلہ۔ تیری آنکھیں نرگس مثال ہیں، تیرے بال جنھیں کالی رات سے تشبیہہ دی جائے تو کم ہے۔ تیرے ناز و انداز کا ظلم یہ ہے کہ گاؤں گاؤں ویران ہوگئے۔ تیرے لبوں کی مٹھاس ایسی کہ سارا بنگال مخمور ہوگیا۔ میں جب سے تیری محبت کا دیوانہ ہوا ہوں سنسار میں رات دن حیران و پریشان تنہا پھر رہا ہوں۔ ساری دنیا میں تیرے حسن کا جواب نہیں۔ آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اے شوقی ہماری جدائی کا زمانہ کیا بتائیں۔ اس کا پاسنگ بھر بھی بیان ہو تو لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجائے۔

○●○

(ج) غزلِ مسلسل دبستانِ اورنگ آباد میں

GM.

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے سقوط کے بعد ادھر دکن میں اردو شعر و ادب کا منظر نامہ دھندلا جاتا ہے۔ نہ یہاں وہ بادشاہ رہے اور نہ شعر و ادب کی وہ سرپرستی۔ شاعر یقیناً ہوں گے لیکن سرپرستی نہ ہونے کے باعث ان کے جوہر نمایاں نہیں ہوسکے۔ چناں چہ یہاں سے شعر و ادب کا مرکز منتقل ہوکر اورنگ آباد چلا جاتا ہے۔ اورنگ آباد میں صورتِ حال پہلے ہی سے ساز گار تھی اور یہاں کی مٹی بھی نم۔ محمد تغلق اور اس کے بعد بھی اورنگ آباد کا دلّی سے گہرا تعلق رہا اور یہ اردو کے ادبی مرکز کی حیثیت سے افق پر روشن ہوتا گیا۔ یہاں شعروادب کا چرچہ بھی کہیں زیادہ رہا اور دلّی سے نسبتاً قربت کی وجہ سے یہاں کی زبان بھی گول کنڈہ اور بیجاپور کی زبان کے مقابلے میں نکھری، ستھری اور صاف و شفاف رہی۔ اورنگ آباد سے جو شاعر اٹھے ان میں ولی جیسا شاعر بھی ہے، جس کو مولانا محمد حسین آزاد نے "اردو کا باوا آدم" قرار دیا ہے۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ کی دریافت کے بعد ولی کو یہ مرتبت حاصل نہ رہی ہو لیکن اردو شاعری میں اس کی برتری اور بالادستی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ولی نے اور اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ولی کی غزل ولی کی غزل ہے۔ ولی نے اپنے دور کی شاعری میں موجود تمام موضوعات کو اختیار کیا اور اس کے ہاں اس دور کی شاعری کے مطابق حسن و عشق

کے موضوع کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ولی نے نظم گوئی کی طرف مجموعی طور پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن ان کے ہاں غزلِ مسلسل کی کئی ایک مثالیں مل جاتی ہیں جن کا موضوع زیادہ تر محبوب اور حسنِ محبوب ہے۔ ذیل میں ولی کی ایک ایسی ہی غزلِ مسلسل درج کی جاتی ہے۔

❄

طاق ابرو ترا حرم دستا — محرم اس کا عرب عجم دستا
خط ترا سر نوشتہ عاشق سوں — حرف تقدیر کا رقم دستا
مکھ ترا آئنہ سکندر ہے — ہر دو عالم منیں عدم دستا
لوح محفوظ ہے ترا رخسار — زلف اس پر مگر قلم دستا
تجھ زنخداں کے چاہ کنعاں میں — یوسفِ مصر دم بہ دم دستا
خط ترا ہے اگرچہ لشکرِ حسن — کاکل اس پر مگر علم دستا

جانِ من غصہ و غضب تا کے
ولی مشتاق پر کرم دستا

| "کلیاتِ ولی" مرتبہ: احسن مارہروی۔ ص: ۳۰-۳۱۔
ناشر: انجمن اردو پریس۔ اردو باغ۔ اورنگ آباد۔ ستمبر ۱۹۲۷ء |

اس غزلِ مسلسل میں ولی نے اپنے محبوب کے سراپا کو انتہائی شاعرانہ انداز میں نزاکت و نفاست کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تیرے ابرو جو کمان جیسے ہیں دیکھوں تو محراب حرم دکھائی دیتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو عرب اور عجم سب جانتے ہیں۔ تیرا خط گویا میری تقدیر کا لکھا ہے اور اس میں میری تقدیر لکھی دکھائی دیتی ہے۔ تیرا چہرہ چہرہ نہیں آئینہ، سکندری ہے جس کو دیکھوں تو یہ دونوں جہاں بے حقیقت دکھائی دیتے ہیں۔ تیرے رخسار گویا میرے لیے لوحِ محفوظ ہیں اور ان رخساروں پر تیری زلف یوں دکھائی دیتی ہے جیسے لوح پر کسی نے قلم رکھ دیا ہو۔ اور تیری تھوڑی چاہِ کنعاں کی طرح ہے جس میں مجھے یوسفِ مصر کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

GMA

اور اگر تیرے خط کو لشکرِ حسن سے تشبیہہ دی جائے تو کاکل اس پر پرچم دکھائی دیتا ہے۔ آخر میں ولی کہتے ہیں کہ اے جانِ من مجھ پر غضب و غصہ کب تک، ولی جو تیرا مشتاق اور چاہنے والا ہے اس پر کرم کر۔

ولی کی ایک اور غزل ہے:

❄

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نئیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھووں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجُن ہاری اس بت کو پجاُتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھین کو لگاتی جا
تجھ عشق میں دل چل کر جوگی کی لیا صورت
یک بار ارے موہن چھاتی سوں لگاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

["کلیاتِ ولی" مرتبہ: احسن مارہروی۔ ص: ۳۲-۳۳-

ناشر: انجمن اردو پریس۔ اردو باغ۔ اورنگ آباد۔ ستمبر ۱۹۲۷ء]

اس غزلِ مسلسل میں بھی محبوب کے حسن اور اس کے انداز و ادا کو مختلف زاویوں سے لیکن تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب میں خود تیری محبت میں جلتا ہوں، تو مجھے اپنے غصّے کے شعلوں سے اور مت جلاتی جا بلکہ میرے دل میں جو آگ لگی ہے اس کو اپنی محبت کے پانی سے بجھادے۔ میں تیری چال کی قیمت سے واقف نہیں ہوں، اے ناز بھری چنچل مجھے اپنا بھاؤ بتاتی جا۔ یہاں بھاؤ سے مراد ناز و انداز بھی ہے اور دام قیمت بھی۔ اور اس اندھیری رات میں کہیں تجھ کو بھول نہ جاؤں تو اپنے پاؤں کے بچھوؤں کی آواز مجھے کچھ تو سنادے۔ میرے دل کا کبوتر تیری لٹوں میں جکڑا ہوا ہے یہ ایک نیک کام ہوگا اگر تو میرے دل کو اس کے چنگل سے چھڑادے۔ تیرے چہرے کی عبادت کرتے ہوئے ساری عمر گنوادی، اب اے بت پرست تجھ سے یہی التجا ہے کہ اس بت کو پوجنے کا موقع دے۔ تیرے عشق میں میرا سارا جسم جل جل کر کاجل ہو چکا ہے تو اگر اس کاجل کو اپنی آنکھوں سے لگائے تو اندازہ ہوگا کہ اس سے آنکھوں کی روشنی کتنی بڑھ جاتی ہے۔ تیرے عشق میں میرے دل نے جوگی کا روپ اختیار کرلیا ہے، اے میری محبوب، ایک بار تو مجھے اپنی چھاتی سے لگالے۔ اے حسنِ مجسم تیرے گھر کی طرف ولی ہمیشہ آیا گیا ہے وہ تیری دید کا مشتاق ہے، بس اب اپنا دیدار کرادے۔

کلیاتِ ولی میں اور بھی ایسی کئی غزلیں مل جائیں گی جن میں ولی نے تسلسل کے ساتھ اور مربوط انداز میں ایک ہی موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک اور غزل کا مطلع پیش ہے۔

❄

تن پیس سرمہ ہو کے لبا تجھ نین میں جا
ہو بوئے گل بسا ہوں ترے پیرہن میں جا

["کلیاتِ ولی" مرتبہ: احسن مارہروی۔ ص: ۳۱-

G M Aur I

ناشر، انجمن اردو پریس - اردو باغ - اورنگ آباد - ستمبر ۱۹۴۰ء

●

سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی بھی دکن کے نمائندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سراج نے کچھ زیادہ مدت تک شاعری نہیں کی لیکن ان کا کلیات خاصا ضخیم اور متاثر کن ہے ۔ سراج جس ماحول میں پلے بڑھے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ تصوف ان کا مزاج بن جاتا۔ ویسے سچ پوچھیے تو سراج اولاً صوفی تھے اور بعد میں شاعر، یہی وجہ ہے کہ اپنے مرشد کی ہدایت پر انھوں نے شاعری ترک کردی۔ ان کا جو بھی کلام ہے وہ دکنی شاعری میں ان کے وزن و وقار کو برقرار رکھنے میں اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ ان کے ہاں تصوف کے موضوعات بھی ہیں اور حسن و عشق کی دل کشی بھی، ان کے ہاں عشقِ مجازی عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور کچھ نہیں۔ ان کی غزلوں میں ایسے ہی اشعار ملیں گے اور دیگر موضوعات پر کم۔ سراج نے دیگر اصناف میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے ہاں غزل ہائے مسلسل بھی کئی ملتی ہیں۔

سراج کی ایک غزلِ مسلسل پیش ہے جس میں انھوں نے محبوب کے تعلق سے اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

❄

آفتِ جاں ہے تمھاری بے حجابی اے صنم
مجھ کوں بے ہوشی ہے تم کو نیم خوابی اے صنم
رشتہ ء امید تیغِ ہجر سیں ہوتا ہے قطع
ناامیدی کوں خجل کر ، آشتابی اے صنم
آشتابی سیں وگر نہ مجلسِ عشاق میں
ظلم ہے، غم ہے، قیامت ہے، خرابی اے صنم

G M Aur

تازہ گل ہر باغ کا ہے مجھ نظر میں تازہ داغ
آتشِ سوزاں ہے فرش ماہ تابی اے صنم
جب ستی ہے ذوق تجھ کوں چہرہ ، گل نار کا
اشک ہے مجھ چشم خونیں کا شہابی اے صنم
جب کرم سیں توں مرا احوال پوچھے روزِ وصل
بس ہے تب مجھ کوں جواب لاجوابی اے صنم
تاب سیں بے تاب ہے تیری جدائی میں سراج
رحم کر عاشق پر اپنے ، ہو ثوابی اے صنم

[" کلیاتِ سراج " مرتبہ: عبدالقادر سروری۔ ص: ۳۲۵۔
ناشر: سلسلہ یوسفیہ۔ شمارہ ۸۔ ۱۳۵۷ ہجری۔]

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اے صنم تیری بے حجابی میری جان کے لیے آفت ہے ، اُدھر تم پر نیم خوابی کا عالم طاری ہے تو میں ادھر بے ہوشی کا شکار ہوں ، ہجر میرے لیے ایک تلوار کی طرح ہے ، تیرے وصال کی امید ختم ہوتی جارہی ہے ، میری ناامیدی کو ختم کر جلد مجھ سے آمل ، اگر تو جلد نہ آیا تو عاشقوں کی محفل میں قیامت بپا ہو جائے گی۔ باغ کا ہر تازہ پھول ایک تازہ داغ ہے اور تیرے ہجر کی وجہ سے چاندنی بھی میرے لیے آتشِ سوزاں بنی ہوئی ہے۔ جب سے تجھ کو چہرہ ، گل نار کا ذوق ہوا ہے میری آنکھ سے خون کے آنسو رواں ہیں۔ جب روزِ وصل تو اپنی مہربانی سے میرا حال پوچھے گا تو میرے لیے لاجوابی کے سوا کوئی جواب نہیں ہو گا۔ آخر میں سراج کہتے ہیں کہ تیری جدائی میں میں حد درجہ بے تاب ہوں اے میرے محبوب تو مجھ پر رحم کر تجھ کو اس کی وجہ سے ثواب حاصل ہو گا۔

کلیاتِ سراج سے ایک اور غزلِ مسلسل پیش ہے:

❄

G M Aur

جس کوں ہوا ہے آئینہ ، دل خیال دوست
روشن ہے اس کی چشم میں نورِ جمال دوست

دانہ دکھا کہ مجھ کوں کیا دام میں اسیر
آخر ہوا ہے آفتِ جاں خط و خال دوست

مہندی کا رنگ ، نہیں ہے کفِ پائے یار پر
خونِ جگر ہوا ہے مگر پائمال دوست

میرے مذاقِ جان میں ہے قند اور نبات
پایا ہوں جب سیں لذتِ شیریں مقال دوست

دیکھا ہوں سب طرف نگہہ امتیاز سیں
کوئی دوسرا نظر نہیں آیا مثال دوست

اے پاک باز گلشنِ آئینہ ، سیر کر
گر تجھ کوں آرزو ہے کہ پاؤں وصال دوست

ساقی بغیر جرعہ ، مے تلخ ہے سراج
کھاتا ہے شیشہ خونِ جگر بے جمال دوست

[" کلیاتِ سراج " مرتبہ: عبدالقادر سروری ۔ ص: ۲۲۱ ۔
ناشر: سلسلہ یوسفیہ ۔ شمارہ: ۸ ۔ ۱۳۵۷ ہجری ۔]

سراج کہتے ہیں: محبوب کا خیال کچھ ایسا ہے کہ جس کسی کے آئینہ ، دل میں یہ خیال آیا ہے گویا اس کی آنکھیں محبوب کے حسن کے نور سے روشن ہو گئی ہیں۔ محبوب کے خط و خال میرے لیے آفتِ جاں ہو گئے ہیں جیسے اس نے دانا دکھا کر مجھ کو اپنے جال میں اسیر کرلیا ہے۔ محبوب کے پاؤں میں یہ مہندی نہیں یہ تو ہمارا خونِ جگر ہے جس کو وہ پاآل کر رہا ہے۔ جب سے میں نے محبوب کی میٹھی گفتگو کی لذت کو پایا ہے میری زندگی میں گویا

قند اور نبات گھل مل گئے ہیں۔ میں نے ہر جا ہر طرف دیکھا لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس کو میں اپنے محبوب سے بہتر قرار دوں۔ سراج کہتے ہیں میں کہ اگر تو محبوب کا وصال چاہتا ہے تو اپنے گلشنِ آئینہ کی سیر کر۔ مقطع میں شاعر کہتا ہے ساقی کے بغیر شراب کا گھونٹ بھی تلخ محسوس ہوتا ہے کیوں کہ محبوب کے جمال کے بغیر شراب پینا بھی خونِ جگر پینے کے برابر ہے۔

اس کے علاوہ بھی اور کئی غزلیں سراج کے کلیات میں مل جاتی ہیں جنھیں دکنی غزلِ مسلسل کے عمدہ نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

•

ولی کے فوراً بعد سرزمینِ اورنگ آباد سے جو سخن طراز اٹھے ان میں داؤد اورنگ آبادی بہ حیثیت ایک صاحبِ دیوان اور قادرالکلام شاعر نہایت اہم ہیں۔ داؤد کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حمید اورنگ آبادی مصنف "گلشنِ گفتار" نے لکھا ہے کہ وہ خوش فکر و خوش طبع تھے اور اکثر و بیش تر نئے مضامین باندھتے تھے (بہ حوالہ گلشنِ گفتار مصنفہ حمید اورنگ آبادی مترجمہ ایم کے فاطمی لکھنو۔ سن ندارد۔ ص:۳۷)۔ اسی طرح داؤد کے ایک اور ہم عصر تذکرہ نگار لالہ لچھمی نارائن شفیق نے داؤد کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شاعر ادا بند و موجد خیالات تھے۔ ان کی شکر بیانی کلام سے اور خوش الحانی نام سے ظاہر ہے (شفیق لالہ لچھمی نارائن اورنگ آبادی۔ چمنستان شعرا مرتبہ عبدالحق اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء۔ ص: ۸۷)۔ داؤد کے کلام سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ انھوں نے ولی کے اسلوب اور رنگ سخن کی اہتمام اور انتظام کے ساتھ پیروی کی اور اسی کو مایہ، کمال سمجھا۔ (ڈاکٹر) خالدہ بیگم نے داؤد اورنگ آبادی کا دیوان مرتب کیا جو ادارہ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع ہوا۔ دیباچہ میں وہ لکھتی ہیں "اورنگ آباد کے شعراء میں داؤد اور سراج اساتذہ، سخن مانے جاتے ہیں۔ داؤد، سراج کے مقابلے میں کم پلہ نہ تھے مگر ان کو سراج کی سی مقبولیت نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ سراج نے دیوان کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں اور تصوف اور عرفان میں شہرت حاصل کی۔ ان کے مرید اور معتقد

بہت تھے۔ داؤد محض ایک غزل گو شاعر تھے اور ان کی غزلیں اتنی بلند پایہ ہیں کہ ان کی استادی میں شبہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی زمانے میں کیا گیا" ("دیوانِ داؤد اورنگ آبادی" مرتبہ خالدہ بیگم۔ حیدرآباد۔ ۱۹۵۸ء۔ دیباچہ۔ ص: ۳)

داؤد کے دیوان میں متعدد غزل ہائے مسلسل پائی جاتی ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محمد قلی قطب شاہ کے بعد سب سے زیادہ غزلِ مسلسل انھیں کے ہاں ملتی ہیں۔ دیوانِ داؤد کی پہلی غزل حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی ہے جس میں انھوں نے پہلے حق تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی ہے پھر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم کی تعریف و توصیف کی ہے اس کے بعد حضرت علیؓ اور اولادِ علی کی منقبت لکھی۔

ایک غزل میں جس کی ردیف " ہرا " ہے، داؤد نے معشوق کے سبز پیرہن کی تعریف لکھی ہے۔ ردیف کے تاثر اور موضوع کی یک رنگی اس غزل کو غزلِ مسلسل کے دائرہ میں لے آتی ہے۔

❄

جب سوں کیا لباس وو گل پیرہن ہرا
یک بارگی دکھا کے چھپ عاشق کا من ہرا

کس رنگ سوں کھڑا ہے زمرد لباس ہو
پر تو سوں جس کے مثل چمن ہے صحن ہرا

وو سرو جامہ زیب پہن کر لباس سبز
کس طرز سوں کھڑا ہے جیوں سرو چمن ہرا

جب سوں ہوں اوس کے سبز قبا کی لکھا غزل
دیواں کے ہر ورق کا ہوا ہے متن ہرا

آتا ہے جب خیال میں وو سرو سبز پوش
ہوتا ہے زہر عشق سوں سب تن بدن ہرا

داؤد عشق سبز قبا کا شہید ہے
لازم ہے اوس کوں وقت دفن کے کفن ہرا

ردیف "ن" میں داؤد نے "تجہ بن" کی ردیف میں قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ تین غزلیں لکھیں اور یہ تینوں غزلِ مسلسل ہیں۔ ان غزلوں میں داؤد نے "تجہ بن" کی رعایت کا پورا خیال رکھا ہے اور ہر غزل محبوب کے بغیر محسوس ہونے والی بے کلی اور بے رونقی کی کیفیات کا مرقع بن گئی ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں کہ محبوب کے بغیر اس کے انتظار میں نرگس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور نسرین و نسترن کی آنکھیں بھی سفید ہو چکی ہیں۔ چمن میں سرو سہی بھی اس کے انتظار میں کھڑا ہے اور کلیاں اس کے بغیر سر بہ گریباں ہیں۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ بلبلوں میں تیرے بغیر فغاں برپا ہے اور تجہ بن گلوں کے گریباں چاک ہیں۔ اے محبوب جلد چمن میں آ کہ تجہ بن چمن زنداں ہو گیا ہے۔ اے شمع رو بزم میں رونق افروز ہو کہ تجہ بن عاشقوں کے لیے انجمن تاریک ہے۔

❄

ہے انتظار میں نرگس کھلی نین تجہ بن
سفید چشم ہیں نسرین و نسترن تجہ بن
کھڑا ہے سرو سہی منتظر ہو تجہ قد کا
ہے غنچہ سر بہ گریباں اے خوش دہن تجہ بن
پڑا ہے شورِ فغاں بلبلاں میں تیرے باج
گلاں ہیں چاک گریباں اے گل بدن تجہ بن
شتاب آ ، اے گلِ نوبہار گلشن میں
ہوا ہے صورت زنداں مجھے چمن تجہ بن
شتاب بزم میں اے شمع رو ہو نور افروز
کہ عاشقاں کوں ہے تاریک انجمن تجہ بن

ہے سیر باغ سوں جیوں غنچہ تنگ دل داؤد
کیا ہے گل کی نمن چاک پیرہن تجہ بن

یہ غزلیں بہ طور مشتے از خروارے پیش کی گئی ہیں۔ داؤد اورنگ آبادی کے دیوان میں بہ کثرت غزل ہائے مسلسل پائی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صنف کو شعوری طور پر برتا ہے اور اس کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

(باب : چار)

غزلِ مسلسل شمالی ہند میں

◆◆◆

G M Shumali

(الف) غزلِ مسلسل عہدِ میر میں

ولی کے سفرِ شمالی ہند سے اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ہوتا تھا غزل ہیں ہر شاعر کی محبوب صنف ہوتی ہے اور اس کی شاعری کی آبرو بھی۔ ہمارے کلاسکی شاعروں میں تقریباً ہر ایک نے غزلیں کہی ہیں یوں دکن کی طرح شمالی ہند میں بھی اردو غزل کا بازار گرم رہا۔ یہاں ہم اردو شاعروں کی غزلوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس شاعر سے اپنے اس باب کا آغاز کرتے ہیں جس دنیائے شاعری میں خدائے سخن تسلیم کیا گیا ہے۔

میر کو خدائے سخن یوں ہی نہیں کہا گیا ہے۔ میر نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور شعر و ادب میں ہر جگہ اپنی خدائی کو ثابت کیا ہے۔ میر کی غزلیں اپنے دھیمے پن، خنکی، آہستگی اور مدھم لہجے کے باعث دلوں میں اتر جاتی ہیں۔ میر کے کلام میں دلّی کا حال بھی ہے اور دل کا بھی اور ہر موقع پر انھوں نے جذبات و احساسات کی ایک دنیا بسائی ہے۔ جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے کلیاتِ میر میں کئی ایک غزلِ مسلسل ملتی ہیں جن سے میر کی استادی اور مُسلّم ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
ایک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بس کہ پریشاں
در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تیری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھے مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

["کلیاتِ میر تقی میر" ص، ۱۵۱ ۔ ناقص الطرفین مرتبہ اور

سنہ اشاعت ندارد ۔مخزونہ کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو ۔حیدر آباد ۔]

اس غزل میں میر نے گویا اپنے احوالِ دل کو کھول کر بیان کر دیا ہے ۔ یہ غزلِ مسلسل میر کی شخصیت کا بھرپور تعارف ہے ۔ وہ کہتے ہیں اے میرے ہم نفسو میں کیا بتاؤں میں کون ہوں ۔ میں تو سوختہ جاں ہوں کہ میرے دل میں ایک آگ سی لگی ہے اور شعلے بھڑک رہے ہیں ۔ میں تو بہ حیثیت انسان ذاتِ الٰہی کے وجود میں ایک راز کی طرح تھا لیکن میرے شوق نے مجھے پردے کے باہر کیا ہے یعنی میں عالمِ وجود میں آیا ہوں ۔ دنیائے شاعری میں میری ہی وجہ سے جلوہ گری ہے ۔ میری طبع رواں سو رنگ رکھتی ہے ، خورشید میں میرا ہی ظہور ہے ، زلفِ بتاں میں میری ہی وجہ سے آراستگی ہے ۔ جس نے بھی مجھے دیکھا میرا دیوانہ ہوا ہے ۔ میں طبع جہاں کی آشفتگی کا سبب ہوں ۔ مجھے لب ہلانے کی مہلت نہ دے کیوں کہ میری زبان پر سیکڑوں باتیں بے چین ہیں ۔ میں چمن والوں کے غموں کے باعث خود بھی مغموم ہوں اور اس باغِ خزاں یعنی دنیا میں ایک سوکھے ہوئے پتے کی حیثیت رکھتا ہوں ۔ خواہش دل مجھے پریشان رکھتی ہے ۔ مجھے مت چھیڑو کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ کہاں ہوں ۔ میری ہستی ، میرا وجود ایک وہم سے زیادہ نہیں پھر بھی میں اپنے محبوب کی طبیعت پر گراں ہوں ۔ آخر میں میر کہتے ہیں کہ حالات ایسے ایسے آن پڑے ہیں کہ میں اس آباد خرابے میں ایک مدت سے پڑا ہوا ہوں ۔ میر کی ایک اور غزل ہے :

❄

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گروِ جام کرو
جنسِ تقویٰ کے تئیں صرف مے جام کرو
فرش مستان کرو جادہ ، بے تہہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
دہن پاک کو آلودہ رکھو بادہ سے
آپ کو مغبچون کے قابلِ دشنام کرو

نیک نامی و تفاوت کو دعا جلد کہو
دین و دل پیشکشِ سادہ ، خود کام کرو
ننگ و ناموس سے اب گذرو جوانوں کی طرح
پرُ فشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
خوب اگر جرعہ ، مے نوش نہیں کرسکتے
خاطرِ جمع مئے شام سے یہ کام کرو
اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب
خدمتِ بادہ گساراں ہی سر انجام کرو
مطرب آکر جو کرے چنگ نوازی تو تم
پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو
خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاس جوشِ گل و دل گرمیِ ایام کرو
سایہ ، گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو
رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

["کلیاتِ میر تقی میر" ص: ۱۸۲ - ۱۸۳ ناقص الطرفین مرتبہ اور سنہ اشاعت ندارد - مخزونہ کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد-]

اسس غزلِ مسلسل میں میر نے شیخ جی کی خوب خوب خبر لی ہے۔ شیخ کا کردار اردو شاعری میں ہمیشہ سے نشانہ بنا ہے۔ہمارے شاعروں نے طرح طرح شیخ کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ میر بھی اپنی اس غزلِ مسلسل میں شیخ کا کچا چٹھا پیش کرتے ہیں۔ وہ شیخ کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اور جامِ شراب کے لیے اپنی جائے نماز کو گروی رکھ دو اور اپنے سارے تقویٰ کو جام کی نذر کر دو۔ جانماز پر مستوں کا فرش کر دو شراب کی تعظیم کرو پیالے کا احترام کرو، شراب کے گھونٹ لو اور مغبچے گالی گلوچ بھی کریں تو برداشت کرو۔ دین اور دل دونوں کو پیش کش سادہ، خود کام کرتے ہوئے نیک نامی کو رخصت کرو۔ عزت و حرمت کی باتوں کو فراموش کرو اور ساقی سے چھیڑ چھاڑ کرو۔اگر شراب نہیں پی سکتے تو اپنی طبیعت کو اسس کے لیے تیار کرو۔ شراب کی صراحی کے احترام میں اٹھ کھڑے ہو اور بادہ گساروں کی خدمت کرو۔ مطرب گانے لگے تو مستوں کی طرح تم بھی اپنا لباسس اتار کر اس کو دے دو۔اسس موسم میں اتنی ٹھنڈک بھی ممکن نہیں، کچھ تو موسم کی گرمی کا لحاظ کرو۔ کہیں پھولوں کے تختے کے سائے میں نہر کے کنارے گلابی رکھو، ہاتھ میں جام لو اور خود کو بدنام کرو۔ کب تک مسجد و خانقاہ میں زندگی گزارو گے، گلستاں میں بھی کبھی صبح و شام گزارو۔ آخر میں میر کہتے ہیں کہ ادھر ادھر کی باتیں تو بہت ہوئیں اب تھوڑی دیر آرام ضروری ہے۔ میر کی یہ غزلِ مسلسل اپنے موضوع کے علاوہ فنی اور ادبی زاویے سے ایک غیر معمولی اچھی غزلِ مسلسل ہے۔اسس کے علاوہ ان کے ہاں اور کئی غزلِ مسلسل ملتی ہیں، ان میں سے دو ایک کے مطلع یہ ہیں:

❄

سنو جب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں
ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرمِ وفا ہوں

❄

یاد ایامے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور شر سے میری اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

●

تصوف برائے شعر گفتن یوں تو سب ہی شاعروں کے پاس تھوڑا بہت ملتا ہے۔ اور یہ شاعر اپنے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے حسبِ توفیق صوفیانہ مضامین کو ادا بھی کرتے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اردو میں صوفی شاعر تین چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ اوران میں ایک اہم نام خواجہ میر درد کا ہے۔ درد پہلے صوفی تھے اور آخر میں بھی صوفی۔ شاعری تو انھوں نے بس یوں ہی کی، ان کے کلام میں یہاں وہاں تصوف کی جو جھلکیاں ملتی ہیں وہ شاعرانہ نوعیت کی نہیں بلکہ درد کی زندگی کے پہلو اوران کے مشاہدات، احساسات اور تجربات ہیں کہ ان کے اظہار کے بغیر ان کی شخصیت مکمل نہیں ہو پاتی، ایسے زمانے میں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوتا ہے، ادھر مرہٹوں کی شورشیں ہیں اور پھر اورنگ زیب کی اولاد تخت و تاج کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایران میں نادر شاہ برسرِ اقتدار آچکا تھا اور اس کی نگاہیں افغانستان اور ہندستان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ۱۷۱۹ء میں درد بہ مقام دہلی پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی اور زمانے کے سرد و گرم سے بے پروا انھوں نے اپنے خاندانی روایات، ماحول اور سماجی و ملکی انتشار کے بعد تصوف سے نہ صرف دل چسپی لی بلکہ تصوف کو اپنی زندگی بنالیا۔ چناں چہ کی ان کی شاعری میں تصوف کے مرقعے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے کئی ناقدینِ شعر و ادب نے درد کو میر تقی میر کا قریب بنادیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر کا رنگ الگ اور درد کا رنگ الگ۔ میر کے ہاں بھی تصوف ملتا ہے لیکن میر صوفی نہیں تھے اور نہ تصوف کا ان کے کلام پر ایسا اثر دکھائی دیتا ہے۔ میر کے ہاں تھوڑا بہت صوفیانہ رنگ و آہنگ ہو لیکن بنیادی طور پر وہ عشقِ مجازی کے شاعر ہیں جب کہ درد کے ہاں عشقِ حقیقی کی کارفرمائی ہے۔ ہاں گردشِ روزگار اور زمانے کے انتشار و اختلال کا دونوں کے ہاں عکس ملتا ہے، جو ایسے پُرآشوب دور میں ضروری تھا۔ درد کی غزل میر کے دور کی غزل ہونے کے باوجود اپنا انفرادی رنگ رکھتی ہے۔ اور اس کو پڑھتے ہوئے قاری ایک اور ہی عالمِ کیف و کم میں پہنچ جاتا ہے۔ درد نے غزل نہیں کہی بلکہ کہنا چاہیے کہ غزل نے اپنے آپ کو درد سے کہلوایا ہے۔ ان کے ہاں غزل میں تصوف کی جو آمیزش ہے اس کا تناسب اس قدر زیادہ ہے کہ کئی

G M ShumaliH

جگہوں پر شاعری کم اور تصوف زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے درد نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں لیکن کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ ہمیں جو ان کی چند غزلیں دست یاب ہوئی ہیں ان میں ایک غزلِ مسلسل پیش ہے۔

مژگان تر ہوں یا رگ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایہ ء قدِ کشیدہ ہوں
ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں
کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ احتیاط
پر آہ میں تو موجِ نسیم وزیدہ ہوں
چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعد مرگ
کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں
اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرہ ء اشک چکیدہ ہوں

["انتخاب کلامِ درد" از پروفیسر سید محمد صدرالدین فاضل شمسی
ص: ۱۱۲ - پبلیشر: پستک بھنڈار - پٹنہ -]

اس غزل میں درد کہتے ہیں کہ حالاتِ زمانہ کچھ اتنے ناگفتہ اور خار و خراب ہیں کہ آرام و اطمینان خواب ہو چکے ہیں۔ دل رو رہا ہے، ذہن پراگندہ ہے۔ آنسوؤں کی وجہ سے مژگاں اتنے تر ہو چکے ہیں کہ لگتا ہے کوئی انگور

کے بیل کی کٹی ہوئی شاخ ہے کہ جس سے پانی نتھر رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبتیں اور آفتیں بے اندازہ پڑی ہیں اور ہم کو اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار ہے۔ میری فروتنی کی وجہ سے محبوب مجھ سے دور ہے۔ اور ایسا تھکا ہوا ہوں کہ کشیدہ قد کا سایا محسوس ہوتا ہوں۔ ہر شام میں شام کی سیاہی کی طرح سیاہ بخت ہوں اور ہر صبح صبح کی طرح میرا گریباں چاک ہے۔ بوئے گل میرے ساتھ احتیاط سے کام لیتی ہے پر میں موجِ نسیم کی طرح چار سو منتشر ہوجاتا ہوں۔ میری تپش دل چاہتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی میں کنج مزار میں آرام سے نہ رہوں۔ درد مقطع میں کہتے ہیں کہ میرا کام ضبط سے ہوچکا ہے اور میں اپنے غم کے باعث ایسے آنسوؤں کا قطرہ ہوں جو ٹپک پڑا ہے۔

درد کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے۔

❄

گر دیکھیے تو مظہرِ آثارِ بقا ہوں
اور سمجھیے جوں عکس مجھے محوِ فنا ہوں

کرتا ہوں پس ازمرگ بھی حل مشکلِ عالم
بے حس ہوں پہ ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں

ممنون مرے فیض کے سب اہلِ نظر ہیں
جوں نور ہر اک چشم کو دیدار نما ہوں

ہے مظہرِ انوارِ صفا میری کدورت
ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہر گز
ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ہوں قافلہ سالار طریقِ قدما درد
جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

["انتخاب کلامِ درد" از پروفیسر سید محمد صدرالدین فاضل شمسی

ص: ۱۱۲-۱۱۳ - پبلیشر: پستک بھنڈار - پٹنہ -]

اس غزل میں درد کہتے ہیں کہ یوں دیکھا جائے تو میں زندگی بردوش ظاہر ہوتا ہوں ورنہ سوچیے تو میں عکس کی طرح ہوں جو فنا ہونے کے قریب ہے۔ میں مرنے کے بعد بھی دنیا کی مشکلوں کو حل کرتا ہوں میں ناخن کی طرح بے حس ہوں پر ناخن ہی کی طرح عقدہ کشا بھی ہوں۔ میرے فیض و کرم کے سارے اہلِ کرم ممنون ہیں، میں نور کی طرح ہر ایک آنکھ کے لیے دیدار نما کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میری کدورت مظہرِ انوارِ صفا ہے، کہنے کو میں لوہا ہوں لیکن آئینہ بنا ہوا جس طرح زنجیر کی آواز اس کی قید میں نہیں ہوتی اسی طرح میں عالَم میں ہوں مگر عالم سے جدا ہوں درد مقطع میں کہتے ہیں کہ میں قدما کے طریقے کا قافلہ سالار ہوں اور مخلوق کے لیے میرے نقشِ قدم رہنمائی کا درجہ رکھتے ہیں۔

درد کے پاس اور بھی مسلسل غزلیں ملتی ہیں لیکن وہی تصوف کے اسرار و رموز سے بھرپور ہیں۔

○●○

(ب) غزلِ مسلسل: ناسخ (لکھنؤ)، غالب (دہلی) اور ان کے ہم عصر شعرا

G M Nasiq

میر کے بعد دنیائے اردو شاعری بالخصوص دبستانِ لکھنو کا ایک اہم نام ہے امام بخش ناسخ۔ ناسخ کے بارے میں اور جو بھی کہہ لیں لیکن زبان و بیان پر بے پناہ قدرت، محاورات، تشبیہات اور استعارات کا استادانہ استعمال، زبان و بیان پر بے اندازہ دست رس اور آدابِ فن کا مکمل خیال، یہ ایسے عناصر ہیں کہ جن کی وجہ سے ناسخ کی شاعری ہمیشہ ہمیشہ اہمیت رکھے گی۔ ناسخ کے ہاں وہ جذبات نگاری کی آمد اور نفسیاتی کیفیات اور رنجِ درون کی کیفیات نہ ملتی ہوں، درد اور سوز و غم کا آہنگ بھی ان کے ہاں نہ ہو لیکن فن کا جتنا احترام اور زبان و بیان کی جتنی فن کاری ان کے ہاں ملتی ہے اس کا جواب نہیں۔ ناسخ نے اور اصناف میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ان کی غزل کا جواب نہیں۔ ناسخ نے قدرتِ بیان کا جو اعلیٰ اظہار کیا ہے وہ ان کی غزل کے ہر شعر سے مترشح ہے۔ انھوں نے بڑے استادانہ رنگ کی غزلیں کہی ہیں۔ ان کے موضوعات روایتی سہی لیکن جس خوبی کے ساتھ انھوں نے ان موضوعات کو کام میں لایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ناسخ نے غزلِ مسلسل بھی کہی ہے اور بڑے کر و فر کے ساتھ بھرپور انداز میں۔ دیوانِ ناسخ کے مطالعے سے ناسخ کی غزلوں اور غزلِ مسلسل میں بھی مرصع سازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناسخ کی کئی غزلیاتِ مسلسل میں سے ایک غزل یہ ہے۔

GMNa

❄

جی میں ہے خارِ بیاباں جائے اختر دیکھیے
زلفِ جاناں کے عوض شامِ غریباں دیکھیے
کھائیے کیوں داغ معشوقانِ گل رخسار پر
مدعا ہے دیکھنے سے بس گلستاں دیکھیے
چل کے چیتوں کی کمر میں کیجیے طوق اپنے ہاتھ
نرگسِ جادو کی جا چشمِ غزالاں دیکھیے
پھیر لیں آنکھیں مژہ سے نیش عقرب کیطرح
کاکلِ پیچاں کے بدلے مار پیچاں دیکھیے
تابکے اغیار میری آنکھ میں کھٹکا کریں
آبلوں میں کچھ دنوں خارِ مغیلاں دیکھیے
کرتے پھریے کیوں کسی کے مصحفِ رخ پر نگاہ
صبح سے تا شام بیٹھے اس سے قرآں دیکھیے
کیجیے اب دیدہ ء غولِ بیاباں پر نگاہ
خشم آلودہ کہاں تک چشمِ گریاں دیکھیے
بہ چکے ہیں اپنی آنکھوں سے بہت سیلابِ اشک
کوہ کے چشموں کو بھی یک چند جو شاں دیکھیے
کر چکے اقلیمِ وحشت میں بہت جوش و خروش
چند مدت عالمِ شہرِ خموشاں دیکھیے
ہوچکیں وہ عشق کے غم میں گریباں چاک چاک

اپنے غم میں گور کا چاکِ گریباں دیکھیے
ہے خدا شاہد یہی ہے اپنی اے ناسخ مراد
کربلا میں روضہ ء شاہِ شہیداں دیکھیے

["دیوانِ ناسخ" مطبع نامی منشی نول کشور۔ کانپور۔
ص: ۹۸ - سنہ اشاعت ندارد - مخزونہ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد۔]

اس غزلِ مسلسل میں ناسخ کہتے ہیں کہ ہم نے دل میں ٹھان لی ہے کہ ستاروں کی بہ جائے بیاباں کے کانٹے دیکھتے رہیں اور زلفِ جاناں کی بہ جائے شامِ غریباں سے لطف اندوز ہوں۔ اس شعر کی خوبی یہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں زلفِ جاناں کی سیاہی اور شامِ غریباں کی تاریکی کو مماثل قرار دیا گیا ہے۔ ناسخ کہتے ہیں معشوقوں کے داغ کیوں سہیں کیوں کہ جب دیکھنا ہی ہے تو گلستاں ہی کیوں نہ دیکھیں۔ چیتوں کی کمر میں اپنے ہاتھوں کا طوق ڈال دیں اور محبوب کی نرگسی، جادو بھری نظروں کی بہ جائے ہرنوں کی آنکھوں کا نظارہ کریں۔ اس غزل کے یہ اور دیگر کئی اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ پر دبستانِ لکھنو کی چھاپ نمایاں ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے نیشِ عقرب کی طرح اپنی آنکھیں پھیر لیں اور کاکلِ پیچاں کی بجائے مارِ پیچاں (سانپ) دیکھتے رہے۔ آخر کب تک اغیار کانٹے بن کر آنکھوں میں کھٹکا کریں، آخر کچھ دنوں تو پاؤں میں جو چھالے پڑگئے ہیں ان کو خارِ مغیلاں سے بھی روشناس کرائیں۔ کیوں کسی کے چہرے پر نگاہ ڈالا کریں ،اس سے بہتر ہے کہ صبح تا شام بیٹھے قرآن دیکھتے رہیں۔ بیاباں کے غول کی نگاہیں دیکھا کریں اور چشمِ گریاں کو کہاں تک چشم آلودہ دیکھیں۔ اپنی آنکھوں سے کہاں تک سیلابِ اشک بہائیں۔ اچھا ہے کہ کچھ دیر پہاڑی چشموں کا بھی نظارہ کریں، ہم نے اقلیمِ وحشت میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اب کچھ مدت کے لیے شہرِ خموشاں کا بھی نظارہ کریں۔ ہم نے عشق میں اپنے گریباں چاک تو کرلیے اور اب قبر کے چاک پر بھی نظر رکھیں۔ مقطع میں ناسخ کہتے ہیں خدا شاہد ہے کہ میری مراد بس اتنی ہے کہ کربلا میں روضہ ء شاہِ شہیداں دیکھوں۔

ناسخ کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

زور ہے گرمیِ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھکو قدم اُٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہیں ترے عہد میں کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیندار ترے کوچے میں

پانوں پھیلائے زمیں پر میں پڑا رہتا ہوں
صورتِ سایہ ء دیوار ترے کوچے میں

روز یاں سیکڑوں بیہوش پڑے رہتے ہیں
ہے مگر خانہ ء خمّار ترے کوچے میں

پاسبانوں کی طرح راتوں کو بیتابی سے
نالے ہم کرتے ہیں اے یار ترے کوچے میں

زور ہے عشق میں یہ تفرقہ پردازی کا
ہم ہیں زنداں میں دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں تو یہیں دفن بھی ہوں
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

گر یہی ہیں ترے ابرو کے اشارے قاتل
آج کل چلتی ہے تلوار ترے کوچے میں

جیسے جنت میں ہیں اور بس رہوں میں بھی مدام
لائیں گر طالعِ بیدار ترے کوچے میں

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

["دیوانِ ناسخ" مطبع نامی منشی نول کشور۔ کانپور۔
ص ۳۸۰ - سنہ اشاعت ندارد - مخزونہ ادارہ ادبیات اردو - حیدر آباد۔]

ناسخ کہتے ہیں تیرے کوچے میں بڑی ہلچل اور چلت پھرت ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ تیرے سارے چاہنے والے جمع ہوچکے ہیں۔ تجھ کو دیکھنے کے بعد ہم اس قدر محوِ حیرت ہیں کہ ساکت و صامت ہمارا قدم کہاں اٹھ سکتا ہے، ہم تو تیرے کوچے میں صورتِ دیوار خاموش سے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تیرے عہد میں دیر بھی ویران ہے، کعبہ بھی سنسان ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جتنے کافر و دین دار ہیں دیر و کعبہ چھوڑ کر تیرے کوچے میں آگئے ہیں۔ میرا حال یہ ہے کہ میں پاؤں پھیلائے زمیں پر پڑا ہوا ہوں گویا تیری گلی میں صورتِ سایہ ء دیوار میرا وجود ہے۔ یہاں تو ہر روز سیکڑوں ایسے ہیں جو بے ہوش پڑے رہتے ہیں اور راتوں میں ہمارے نالہ و زاری سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم پاسبانوں کی طرح رات بھر اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ تیری تفرقہ پردازی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم تیرے کوچے میں ایسے رہتے ہیں جیسے قیدی زنداں میں۔ میری تو یہی آرزو ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی تیرے کوچے ہی میں دفن ہوجاؤں، بس مجھے اپنی قبر کے لیے تیرے کوچے میں تھوڑی سی زمین درکار ہے۔ تیرے ابرو کے اشاروں سے عشاق یوں قتل ہوتے ہیں جیسے لگتا ہے تیرے کوچے میں تلوار چل رہی ہے اور لوگ جاں بہ حق ہورہے ہوں۔ میری تقدیر اگر مجھے تیرے کوچے میں لے آئے تو میں یہاں ایسے رہوں جیسے کوئی جنت میں ہوں۔ ناسخ کا کیا ہے وہ جب اپنا حالِ دل نہیں کہہ پاتا تو تیرے کوچے میں اپنے اشعار پھینک جاتا ہے۔ لکھنو کے طرزِ سخن کا اظہار اس مقطع کے دوسرے مصرعے میں "پھینک جاتا ہے" کے الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔ یہ اسلوب کوئی لکھنوی شاعر ہی اختیار کرسکتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔

ان غزلوں کے علاوہ ناسخ کے دیوان میں اور بھی غزلیں ملتی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

❄

قامتِ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہین
سرو کو صدقے میں آزاد کیا کرتے ہین

["دیوانِ ناسخ" مطبع نامی منشی نول کشور۔ کانپور۔
ص ۳۸۰ - سنہ اشاعت ندارد - مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد۔]

●

آتش بھی اپنے دور کے صف اول کے اور ممتاز شعرا میں گزرے ہیں۔ ان کو لکھنو کے ان شعرا میں شمار کیا جاسکتا ہے جن سے دبستانِ لکھنو کی آبرو قائم ہے۔ آتش نے لکھنوی شعری آداب کی تکمیل کرتے ہوئے لکھنوی تہذیب اور شعر و ادب کی ساری خصوصیات کو اپنے میں مجسم کردیا۔ ان کے ہاں بناوٹ، تصنع، تشبیہات، محاورات، تلمیحوں اور استعاروں کا کچھ ایسا استعمال کیا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آتش کی غزل، مختصر یہ ہے کہ آتش کی غزل ہے اور اپنے طرز اور لہجے کی وجہ سے لکھنوی شعرا سے بھی بہ آسانی ممیز کی جاسکتی ہے۔ کلیاتِ آتش میں اس بیان کے ثبوت میں بے اندازہ غزلیں ملیں گی۔ چوں کہ آتش مکمل اور بھرپور غزل گو شاعر ہے اور انھوں نے دیگر اصنافِ سخن پر کم ہی توجہ دی اس لیے ان کے ہاں غزل ہی معراجِ کمال پر ملتی ہے۔ آتش کے ہاں مسلسل غزلیں بھی ہیں لیکن تعداد میں کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ یہاں ان کی ایک غزلِ مسلسل پیش کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ غزل ہے :

❄

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا

رخِ بے داغ دکھلایا تو ہوتا
گلِ لالہ کو شرمایا تو ہوتا
چلے گا کبک کیا رفتار تیری
یہ اندازِ قدم پایا تو ہوتا
نہ کیوں کر حشر ہوتا دیکھتے ہم
قیامت قد ترا لایا تو ہوتا
بجا لاتے اسے آنکھوں سے اے دوست
کبھی کچھ ہم سے فرمایا تو ہوتا
تری صورت سے ہنسنا تھا نہ لازم
گلوں نے منھ تو بنوایا تو ہوتا
اکڑنا بھول جاتے سرو و شمشاد
یہ قد بوٹا سا دکھلایا تو ہوتا
کہے جاتے وہ سنتے یا نہ سنتے
زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا
صنوبر سے جو کرتا قدکشی تو
یہ گڑ جاتا تو ہنٹایا تو ہوتا
سمجھتا یا نہ اے آتش سمجھتا
دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

[" کلیاتِ آتش " مطبع نامی منشی نول کشور - کانپور - ص ۳۱۰ - سنہ اشاعت ندارد - مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد -]

آتش کی یہ غزل قطعی طور پر حسن و عشق کے موضوع کے ارد گرد گھومتی ہے اور وہ بھی روایتی حسن و عشق کے حوالے سے۔ آتش کی شاعری عمومی طور پر بھی روایتی شاعری ہے، زلف و گیسو، خال و خط، لب و رخسار اور گل و بلبل سے آگے نہیں بڑھی۔ اس غزل کا بھی یہی حال ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے اور اس طرح کہتا ہے کہ محبوب نے اپنی زلفوں کو بل تو دیا ہوتا۔ گیسوؤں کو سنبل سے تشبیہ دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے ان زلفوں کو لہرایا تو ہوتا۔ اگر محبوب نے اپنا بے داغ چہرہ دکھلایا ہوتا تو لالہ کا پھول بھی شرما جاتا۔ یہاں نزاکتِ بیان یہ ہے کہ لالہ کے پھول میں داغ ہوتا ہے جب کہ محبوب کا چہرہ بے داغ ہے۔ شاعر کہتا ہے "کبک" تیری رفتار کو کیا اپنائے گا کہ تیرے اندازِ قدم کچھ اور ہی ہیں۔ قیامت کے قد سے تیرا کیا مقابلہ تیرا قد کچھ اور ہی ہے، ہم دیکھیں گے کہ قیامت میں حشر کیسے اُٹھتا ہے۔ آتش محبوب سے کہتے ہیں کہ ہم تو تیرا حکم بجالانے کے لیے تیار ہیں، کبھی تو ہم سے کچھ فرمایا تو ہوتا۔ تو کہاں اور پھول کہاں پھول ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں! لیکن تیرے جیسا منھ کہاں سے لائیں۔ سرو و شمشاد اونچے اور سیدھے قد کے سہی لیکن تو نے اپنا بوٹا سا قد انھیں دکھلایا ہوتا۔ ہمارا تو کام تھا وہ سنے نہ سنے ہم کہے جاتے، لیکن حالِ دل ہم زباں تک لا ہی نہ سکے۔ صنوبر کو بھی اپنے قد پر بڑا ناز ہے لیکن اگر تو انھیں دکھائی دیتا تو وہ شرم سے گڑ جاتا۔ آخر میں آتش کہتے ہیں ہمارے دل کا عالم کون جانے اس کی بے چینی کا راز نہیں کھلتا لیکن ہم کو چاہیے تھا کہ ہم اپنے دل کو سمجھانے کی سعی کرتے۔ کلیاتِ آتش میں اور بھی ایسی غزلیں ملتی ہیں۔

•

غالب نے قصیدے اور مثنوی کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ دی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق ہی نہیں اپنے مزاج کے مطابق بھی غزل کو نہ صرف ترجیح دی بلکہ اس کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا کہ آج بھی اردو غزل کے افق پر اگر کوئی تابناک نام ملتا ہے تو وہ ہے اسداللہ خاں غالب۔ غالب کے مشہور شعر ؎

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

کی روشنی میں کہنے والے کہہ جاتے ہیں کہ غالب ظرفِ تنگ نائے غزل سے نالاں سے تھے اور کسی دوسری صنف کے متلاشی۔ ایسا قطعی نہیں ہے۔ مذکورہ غزل دراصل تجمل حسین خاں کی مدح میں لکھی گئی تھی جس کا خود غالب نے اس شعر میں اعتراف کیا ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غالب کی شناخت غزل سے اور غزل کی شناخت غالب سے ہے۔ غالب نے یہی وجہ ہے کہ قصیدے تو لکھے لیکن نہ صنفِ قصیدہ کے شایانِ شان اور نہ اپنی شان کے مطابق۔ غزلوں ہی میں ان کے اوجِ کمال اور تاج داریِ سخن کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب نے غزلوں میں قطعات سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن ان کے ہاں کچھ غزلیاتِ مسلسل بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں متداول دیوانِ غالب ہے غالب کا نہایت سختی کے ساتھ کیا گیا انتخاب ہے، ورنہ ممکن ہے ان کے ہاں غزلیاتِ مسلسل بھی کئی ملتیں، لیکن یہی کیا ہے اس مختصر سے دیوان میں بھی چند ایک غزلیاتِ مسلسل سے سابقہ پڑتا ہے۔ غزل گو شاعر ہونے کی وجہ سے غالب کے ہاں ارتکازِ فکر کی تلاش نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ان کی غزلیاتِ مسلسل پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے مافی الضمیر کا اظہار اس ندرت، قدرت اور پُرکاری سے کیا ہے کہ انھوں نے غزلِ مسلسل میں جس موضوع کو اختیار کیا ہے کوشش کی ہے کہ اس کے سارے رنگ اور رخ یک جا ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلِ مسلسل قاری کو متوجہ اور متاثر بھی کرتی ہے۔ ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے:

❄

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ٔ ابر آب تھا
شعلہ ٔ جوالہ ہر یک حلقہ ٔ گرداب تھا
جلوہ ٔ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں ، وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کم خواب تھا
یاں ، نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
جلوہء گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش ، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں ، اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل ، کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا
مقدم سیلاب سے ، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانہ ، عاشق ، مگر ، سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک ، تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں ، اک دیدہء بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالب کو ، وگر نہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

[''دیوانِ غالب جدید'' المعروف بہ نسخہ ءحمیدیہ مرتبہ محمدانوارالحق۔

ص، ۱۵۔ سنِ اشاعت ، ندارد ۔ناشر، ندارد ۔ مخزونہ ، ادارہ ءادبیات اردو۔]

اس غزلِ مسلسل میں غالب نے شبِ ہجر کی بے کلی ،شکستہ دلی ،مایوسی اور خستگی کا نقشہ عمدگی کے ساتھ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں: شبِ ہجر کا عالم وہ تھا کہ دل کی گرمی سے ایسی بجلیاں گررہی تھیں کہ ابر کا جگر پانی ہورہا تھا۔ سمندر میں گرداب کے حلقے نہیں بلکہ شعلہ ء جوالہ محسوس ہورہے تھے۔ ہم تو ہجر میں خون کے آنسو رو رہے تھے لیکن محبوب کے ہاں نہر کے کنارے جلوہ ء گل سے چراغوں کا منظر بن گیا تھا۔ ہم تو یہاں سو نہ سکنے کے باعث دیوار سے اپنا سر ٹکرارہے تھے اور ہمارا محبوب تھا کہ نازوادا سے کم خواب کے تکیے پر اپنا سر رکھ کر محوِ خواب تھا۔ ہم کہ بزمِ بے خودی میں شمع روشن کررہے تھے اور وہاں ہمارا محبوب اپنے احباب کی محفل میں محو تھا۔ یہاں یہ عالم تھا کہ زمیں سے آسمان تک سوزش اور جلن کے سوا کچھ نہ تھا اور وہاں فرش سے عرش تک رنگینیاں ہی رنگینیاں تھیں۔ ایسے میں ہمارے ناخنوں نے دل کو کریدا کہ لذت ملے لیکن دل سے خون ٹپکنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہمارا رونا ایسا تھا جیسے دل کو اسی سے سکون حاصل ہوتا اور اس رونے سے جو سیلاب آیا خانہ ءعاشق میں اس کی صداؤں کے سوا کچھ نہ رہا۔ غالب کہتے ہیں میری جو خاک نشینی میں گزری وہ اس لیے قابلِ فخر ہے کہ میں نے اپنے خیالوں میں اس بسترِ سنجاب پر بسر کی۔ ہمارے نارسا جنوں نے اس طرف توجہ نہ دی ہو ورنہ یہاں کا ذرہ ذرہ سورج کے مدِّ مقابل ہوسکتا تھا۔ پھر وہ اپنے محبوب سے یہ بھی کہتے ہیں کہ آج اس کو اپنے عاشقوں کی پروا نہیں حالاں کہ کل تلک اس کا دل بھی مہر و وفا سے بھرپور تھا اور وہ اپنے چاہنے والوں کا یوں منتظر رہتا جیسے جال کے حلقے اپنے شکار کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ آخر میں بات یوں ختم کرتے ہیں کہ انھوں نے شبِ ہجراں میں ضبط سے کام لیا ورنہ وہ اتنا روتے ،اتنا روتے کہ آنسوؤں کا سیلاب آجاتا اور آسمان کی حیثیت سیلاب پر کف کی طرح ہوتی۔

ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

درد سے میرے ہے تجھ کو بےقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردہء اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

["دیوانِ غالب جدید" المعروف بہ نسخہ حمیدیہ مرتبہ محمد انوار الحق۔ ص، ۱۹۳- سنِ اشاعت، ندارد۔ ناشر، ندارد۔ مخزونہ، ادارہ ادبیات اردو۔]

عام طور پر یہ غزل مرثیہ جیسی سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ غالب نے اپنے کسی محبوب کے انتقال پر اس کی تخلیق کی۔ چوں کہ یہ غزل کی ہیئت میں ہے اور غزلِ مسلسل کی کیفیت لیے ہوئے اس لیے غزلِ مسلسل کے ذیل ہی میں اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ ہائے افسوس میرے درد سے تو بے قرار ہے جب کہ محبوب اپنی غفلت شعاری سے ہمیشہ ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ محبوب نے کیوں موت کو گلے لگا لیا اور آشوبِ غم کا حوصلہ نہ ہونے کا مظاہرہ کیا حالاں کہ کبھی وہ غم گساری سے بھی پیش آتا تھا۔ جب یوں جدا ہونا تھا تو کیوں غم خواری سے پیش آیا اور دوستی کی۔ غالب کہتے ہیں کہ محبوب نے پیمانِ وفا تو باندھا لیکن کیا کیا جائے کہ عمر ہی کو استحکام حاصل نہ تھا۔ محبوب کو رسوائی کا ڈر اتنا تھا کہ الفت کی پردہ داری کرتے ہوئے اس نے نقابِ خواب میں منہ چھپا لیا۔ کبھی محبوب تھا اور اس کے ناز و جلوہ کی گل فشانی لیکن آج اسی کی قبر پر پھول ڈالے جا رہے ہیں۔ مجھے زندگی زہر لگتی ہے کیوں کہ میرے محبوب کو یہ زندگی راس نہ آئی۔ اس نے زندگی بھر جفاؤں سے کام لیا تیغ آزمائی کی لیکن افسوس کہ دل پر ایک بھی زخم کاری نہ لگا۔ محبت میں دعدوں کی عزت و ناموس مٹی میں مل گئی، لگتا ہے دنیا سے دوستی کے طور طریقے ہی اٹھ گئے۔ برسات کی اندھیری رات کس طرح کٹے گی کہ نگاہوں کو تارے گننے کی عادت ہے اور اب برسات کے باعث آسمان پر کوئی تارہ بھی نہیں۔ دل کی

ناامیدی کا یہ عالم ہے کہ نہ تو محبوب کا جلوہ ہے اور نہ نامہ و پیام۔ غالب کہتے ہیں اگر مصیبت ہی اٹھانی تھی تو غربت میں اٹھالیتے دہلی میں رہ کر یہ ذلت اٹھائی نہیں جاتی۔ ابھی ہمارے عشق نے شدت اختیار ہی نہ کی تھی کہ ذوقِ خواری افسوس کہ دل ہی دل میں رہ گیا۔ دیوانِ غالب میں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ہیں جو پڑھنے والوں کو متوجہ کرتی ہیں ایسی چند ایک غزل ہائے مسلسل کے مطلعے پیش ہیں :

❄

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

["دیوانِ غالب جدید" ص، ۲۷۔ مخزونہ ، ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔]

❄

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

["دیوانِ غالب ناز ایڈیشن" ص، ۸۳۔ ناشر: ناز پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی۔]

●

سلطنتِ مغلیہ کا زوال ایک سلطنت کا زوال ضرور تھا لیکن اردو شاعری کو اس دور میں جو عروج و اقبال حاصل ہوا اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ یہ صحیح ہے مغل سلطنت سکڑ سمٹ کر از دلی تا پالم ہو چکی تھی، انگریزوں کی چیرہ دستی اور ظلم و ستم کے باعث ہندستانی مجبوروں اور بے کسوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ جو مغل شہنشاہوں کی شان تھی وہ ساری چکا چوند، دھندلا گئی تھی بلکہ کہنا تو چاہیے کہ تاریکی بڑھ رہی تھی اور حالات ناگفتہ بہ ہوتے جارہے تھے۔ ایسے میں اور کچھ نہ ہو اردو شاعری کا آسمان منور تھا اور اس دور میں جو شاعر موجود تھے ان کی مرتبت کا اندازہ کوئی کیا لگا سکتا ہے کہ ان کے تذکرے کے بغیر اردو شاعری کا افق ماند پڑ جاتا ہے۔ غالب، ذوق، ظفر، مومن، شیفتہ، صہبائی جیسے شاعر نہ صرف اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے بلکہ آج بھی

ان کی عزت و عظمت فزوں ہے ۔ غزل اس دور کی مقبولِ عام صنف تھی ۔ مشاعرے دربار کی رونق تھے تو شہر کی چہل پہل بھی انھیں کے دم سے تھی ۔ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں خواہ کچھ کہا جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ٹوٹتی بکھرتی سلطنت کے فرماں روا ہوں تو ہوں اردو شاعری کے چمکتے دمکتے آسمان پر ماہِ نیم ماہ کی حیثیت بھی رکھتے تھے ۔ سلطنتِ شاعری میں ان کی فرماں روائی اس وقت بھی مسلّم تھی اور آج بھی مسلّم ہے ۔ ظفر نے ذوق سے اصلاح لی ہو لیکن ان کا اپنا رنگ ہے ۔ وہ جن ناگفتہ بہ حالات سے گزرے اس کی کھنک ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے ۔ جس درد و غم سے وہ گزرے اور جن آلام و مصائب کا انھوں نے سامنا کیا ان سب کی ترجمانی نہایت پُرسوز اور دردمندانہ پیرائے میں ان کے کلام میں ملتی ہے ۔ ان کے ہم عصر کسی اور شاعر کا کلام اس قدر پُرسوز اور دلوں کو متاثر کرنے والا نہیں جتنا ظفر کا ہے ۔ ظفر نے غزلیں کہیں اور اپنے رنگ کی غزلیں ۔ ان کے ہاں درد و غم سے بھرے اشعار لگ بھگ ہر غزل میں مل جاتے ہیں اور کہیں کہیں آلام کی یہ کیفیت اتنی فزوں اور تیز تر ہے کہ ساری غزل غمگین کیفیت اور دلوں پر تیر چلانے والا انداز لیے ہوتی ہے ۔ ظفر نے اور بھی لکھا ہے لیکن ان کا اصل شعری سرمایہ غزل ہے ۔ ان کے دور کی شعری روایت کا احترام بہ اہتمام ظفر کے ہاں ملتا ہے اور غزل کے سارے آداب و انداز ان کے ہاں نکھر جاتے ہیں ۔ جہاں تک غزلیاتِ مسلسل کا تعلق ہے ظفر کا دیوان ان سے خالی نہیں ۔ موضوع زیادہ تر وہی حسن و عشق اور یہ غزلیں غم گین کیفیت لیے ہوئے ہوتی ہیں ۔ لیکن اپنی غزلوں میں انھوں نے آن بان برقرار رکھی ہے ۔ غزلِ مسلسل میں تو یہ کیفیت اور نکھر جاتی ہے ۔ ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے :

❄

کیا وصف جبیں میں کہوں اس ماہِ جبیں کا
اک تختہ سراسر ہے وہ فردوسِ بریں کا
یا صبح ہے یا آئینہ یا ہے یدِ بیضا
یا صفحہ، رخسار کسی شوخ جبیں کا

یا مشتری و زہرہ و یا مہرِ درخشاں
یا جلوہء پُر نور ہے وہ ماہِ مبیں کا
یا تختہء بلور ہے یا لوح ہے سیمیں
یا صفحہء سادہ کسی انمول نگیں کا
کیا زور زمیں شعر کی یہ تونے نکالی
ہے وصف ظفر اس میں بیاں ان کی جبیں کا

["دیوانِ ظفر" باہتمام محمد عبدالمجید ص: ۳۔ سنِ اشاعت: ندارد۔
مطبع: مجیدی' کانپور۔مخزونہ ادارہء ادبیاتِ اردو۔]

غزل کے مطلع میں ظفر کہتے ہیں کہ میں اس چاند جیسی پیشانی رکھنے والے اپنے محبوب کی جبیں کی خصوصیت کیا بیان کروں کہ وہ تو سراسر جنت کے ایک تختے جیسی ہے۔ اس کی پیشانی کا عالم یہ ہے کہ جیسے صبح ہورہی ہو یا آئینہ ہو یا ید بیضا۔ آگے ظفر یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی پیشانی مشتری و زہرہ کی طرح ہے یا مہرِ درخشاں کی طرح پُر نور ہے۔ اس کی پیشانی چاندنی کی طرح ہے یا کسی انمول نگینے کی طرح ہے اور آخر میں ظفر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ محض اپنے محبوب کی پیشانی کی خوبی بیان کرنے کے لیے انھوں نے یہ غزل کہی ہے ظاہر ہے غزل میں محبوب کی صرف پیشانی کا تذکرہ ہے اور باقی سب اسی کے ذیل میں آتا ہے۔

ہمارے اور شاعروں کے مقابلے میں ظفر کی اس غزلِ مسلسل کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے صرف تسلسلِ بیان کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ ایک ہی موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن اس کو ہم نظم اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں غزل کی ہئیت اور اس کے دیگر فنی اور شعری لوازم کو استعمال کیا گیا ہے۔

ظفر کی غیر معمولی معروف غزلِ مسلسل ملاحظہ ہو:

❄

G M Nasiq

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا ، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمنِ خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمہ ، جاں فزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

| ''انتخابِ کلامِ ظفر'' مرتبہ، حالی پبلشنگ ہاؤس-دہلی - ص: ۱۳-
سنِ اشاعت، اکتوبر ۱۹۵۷ء - مخزونہ، ادارہ ادبیاتِ اردو- |

ظفر پر جو غم کے پہاڑ ٹوٹے، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی سلطنت ہی نہیں لٹی بلکہ ان کی اولاد بھی اپنی جان سے محروم ہوئی۔ تخت چھوٹا، تاج چھوٹا، وطن کی سرزمیں چھوٹی اور ایسی کہ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔ اس غزلِ مسلسل میں ظفر نے انھیں کیفیات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ میں کسی کی آنکھ کی روشنی بن سکا نہ کسی کے دل کو میری وجہ سے قرار و سکوں حاصل ہوا۔ میں مٹھی بھر مٹی تھا، کسی کے کام نہ آسکا۔ ظفر اپنی اور اپنے سلطنت کے عروج و زوال کی داستاں یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا رنگ روپ بگڑ گیا، میرے چاہنے والے بچھڑ گئے، میرا محبوب مجھ سے دور ہو گیا۔ میں کبھی فصلِ بہار کی حیثیت رکھتا تھا لیکن آج ایسا چمن ہوں جو خزاں کی زد میں ہے، اجڑا ہوا اور بے منظر۔ اپنے زوال اور بے بسی و بے کسی کی تشریح کرتے ہوئے ظفر کہتے ہیں کہ میں کسی بے کس کے مزار جیسا ہوں جس کا کوئی نہیں کیوں کہ میری قبر پر نہ کوئی فاتحہ کے لیے آتا ہے، نہ پھول چڑھاتا ہے اور نہ کوئی شمع جلاتا ہے۔ حسرتوں کی انتہا یہ ہے کہ کوئی میرا پوچھنے والا ہے اور نہ کوئی وارث میری طرف متوجہ ہونے والا ہے۔ کوئی مجھے سننا ہی نہیں چاہتا کہ میں ایک نغمہ، جاں فزا کی حیثیت نہیں

رکھتا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ میں بڑے بزرگ کی صدا ہوں اور ایک ایسے دل کی پکار ہوں جو پے بہ پے دکھوں کا شکار ہو چکا ہے۔

ظفر کے دیوان میں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک اور غزل ملاحظہ میں پیش ہے:

❄

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایاء ہند تبہ ہوئی ، کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے ، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی ، یہ تھا اک چمن ، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے ، یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی ، جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھول میں جو تلُے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے ، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

نہ وبال تن پہ ہے سر مرا ، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا ، مجھے اپنی زندگی بار ہے
کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا ، جو خدا نے چاہا تو برملا
ہمیں ہے وسیلہ رسول کا ، وہ ہمارا حامیء کار ہے

["انتخابِ کلامِ ظفر" مرتبہ، حالی پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔ ص، ۱۳۔
سنِ اشاعت، اکتوبر ۱۹۵۷ء ۔ مخزونہ، ادارہء ادبیاتِ اردو۔]

شاعر اس غزل میں پہلی جنگِ آزادی کے بعد کی ان کیفیات کو پیش کرتا ہے جن سے صرف وہی نہیں گزرا بلکہ دلی کے عوام الناس بھی گزرے ہیں۔ کہتا ہے حالات نے یوں پلٹا کھایا ہے کہ میرے دل کا قرار ٹوٹ گیا۔ میں ظلم و ستم کا کیا بیان کروں کہ میرا سینہ غم سے پھٹا جارہا ہے۔ ہندستان کی رعایا جس طرح تباہ ہوئی اور ان پر جو مصیبتیں ڈھائی گئیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے کہ حاکمِ وقت نے جس کسی کو دیکھا قابلِ دار قرار دے کر سولی پر چڑھا دیا۔ ظلم اور ایسا ظلم ہوا کہ بے گناہ لوگوں کو پھانسی دے دی گئی اور خاص طور پر مسلمانوں کے تعلق سے فرنگیوں کے دل میں ابھی تک کدورت باقی ہے ،شہر دلی تب ایک ہرا بھرا چمن تھا ، ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ تھا لیکن سامراجیوں نے سارے خوش نما مناظر کو تہس نہس کر دیا اور اب تو دلی اجڑا دیار بن گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مصیبت کسی ایک پر پڑی ہو بلکہ سب ہی تنگ حالی کا شکار ہیں۔ جو بہاروں کے دن تھے اب وہ خزاں مثال ہیں ، جو عروج پر تھے وہ زوال سے دو چار ہیں ، وہ لوگ جو رات دن عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے ، پھولوں میں تلتے تھے ، آج وہ غم کے کانٹوں سے دوچار ہیں تو سوچیے ان کی کیسی گزر رہی ہوگی۔ ان کے گلوں میں طوق ڈالے گئے ہیں اور کہا جارہا ہے کہ پھولوں کے بدلے یہی ہار تمھارا نصیب ہے۔ ہر طرف ماتم ہی ماتم ہے ،تقدیر گردش میں ہے اور حالات ناموافق ہیں ، جیسے سب کچھ چھن گیا ہو ، نہ تاج باقی ہے نہ تخت ، نہ کوئی بادشاہ ہے نہ کسی کی سلطنت ، وہ لوگ جو کبھی اوروں سے اچھا سلوک کرتے تھے آج وہی ذلیل و خوار ہو چکے ہیں۔ اچھا سلوک کرنے والوں پر آسمان ظلم ڈھا رہا ہے ، ان کا سب کچھ چھین لیا گیا ہے حتیٰ کہ تن پر ایک

تار بھی نہیں۔ ظفر کہتے ہیں کہ میرا سر میرے جسم پر وبال نہیں، نہ مجھے اپنی جان جانے ڈر ہے۔ میرے غم تو اسی وقت ختم ہوں گے جب میرا دم نکلے گا، میری زندگی بوجھ ہے۔ آخر میں اپنے آپ سے کہتے ہیں اے ظفر تو حشر کا غم نہ کر، خدا نے چاہا تو تیرا انجام اچھا ہوگا کیوں کہ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ حاصل ہے اور وہی ہمارے حامی اور شافع ہیں۔

اس پُرسوز غزل کے علاوہ ظفر کے ہاں اور بھی کئی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں جن سے ان کا کمالِ فن ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ غزل مسلسل بھی ہے جس کا مطلع ہے:

❄

کہیں میں غنچہ ہوں واشد سے اپنی خود پریشاں ہوں

کہیں گوہر ہوں اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں

["انتخابِ کلامِ ظفر" مرتبہ، حالی پبلشنگ ہاؤس-دہلی - ص، ۵۳-

سنِ اشاعت، اکتوبر ۱۹۵۷ء - مخزونہ، ادارہ ادبیاتِ اردو-]

●

حکیم محمد مومن خاں مومن کو اردو شعر و ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مومن نے خاص طور پر اردو غزل کو نکھارا اور اس کو نکھارنے اور اس کو ایک نیا موڑ دینے میں غیر معمولی حصہ ادا کیا ہے۔ مومن کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل میں پہلی بار معشوق کو مونث کی حیثیت سے پیش کیا ورنہ تا حال عالم یہ تھا کہ ایرانی شاعری کے زیرِ اثر اور کچھ ہماری تہذیبی اقدار کے نتیجے میں معشوق کو خواہ وہ کچھ ہو بہ طور مذکر مخاطب کیا جاتا اور اس کا تذکرہ بھی ایسے ہی ہوتا۔ ایسا ہونا چاہیے تھا یا نہیں یہ بحث اپنی جگہ لیکن مومن نے نہ صرف مونث کی حیثیت سے معشوق کا ذکر کیا بلکہ ان کا معشوق کوئی طوائف یا بازاری عورت نہیں بلکہ ایک پردہ نشین خاتون ہے جو ایک اعلیٰ مہذب معاشرے کی پروردہ ہے۔ مومن سے قبل اردو غزل اس تصور سے ناآشنا تھی لیکن بعد ازاں مومن کے اس اجتہاد کے باعث نہ صرف ان کے ہم عصر شاعروں نے

G M Nasi
2

بھی اس روش کو اختیار کیا بلکہ ان کے بعد کے شاعروں نے ایسے ہی رویے کو اپنایا کہ آج معشوق کا ایسا تصور عام ہو چکا ہے۔

مومن نے اور اصناف میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے لیکن غزل گو شاعر کی حیثیت سے وہ ہماری شاعری میں یاد رکھے جائیں گے۔ اپنی سلاستِ زبان اور بیان کی ندرت کی وجہ سے مومن کی غزل غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ مومن نے غزل کو اس کے روایتی مفہوم میں استعمال کیا۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے موضوعات عام ہیں۔ معشوق کا سراپا، اس کے حسن و ادا، جفا و ستم، ہجر و وصال اور وفا کیشی کا بیان کمالِ قدرت اور نہایت ہنرمندی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کی غزلیں صرف غزلیں نہیں حسن و عشق کی تصویریں ہیں، انھیں ایسی مرقع نگاری میں کمال حاصل ہے کہ پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شاعری روایتی ہوتے ہوئے بھی روایت سے دور اور ہمارے جذبات و احساسات کی تصویر بن جاتی ہے۔

مومن نے غزل میں کسی ندرت یا جدت سے کام نہیں لیا لیکن غزلِ مسلسل کے خوش گوار تجربے ان کے پاس بھی ملتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے حسن و عشق کی کیفیات اور ذکرِ محبوب کرتے ہوئے وہ غزل کے ایک آدھ شعر سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کیفیت کو شعر در شعر بیان کرتے ہوئے اپنی غزل کو غزلِ مسلسل کی صورت دے دیتے ہیں۔ دیوانِ مومن میں قاری کا ایسی کئی غزلوں سے سامنا ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر وہ غزل جس کا نہ صرف مومن کی بہترین غزلوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ کلاسیکل اردو غزل کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بھی اس کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ غزل ہے:

❄

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو رو بہ رو تو اشارتوں سے ہی گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلہ ء ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

["دیوانِ مومن" مرتبہ، ضیاء احمد ضیا۔ ص ۱۷۲۔ سنِ اشاعت، ۱۹۳۴ء
مطبع، شانتی پریس الٰہ آباد۔ مخزونہ، ادارہ ادبیاتِ اردو۔]

اس خوب صورت غزلِ مسلسل میں مومن نے محبوب کو اس کے وعدے یاد دلاتے ہوئے اس زمانے کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ ملتے، پیار و محبت کی گفتگو کرتے اور داستانِ الفت کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے تھے ۔ اس غزلِ مسلسل کی طویل ردیف " تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو " غزل کے ہر شعر کو دل کش بنا دیتی ہے ۔ اسی کے ساتھ مومن نے مترنم بحر کا انتخاب کرتے ہوئے غنائیت اور موسیقی کا نگار خانہ سجا دیا ہے۔ مطلع ہی سے شکوہ و شکایت کا دفتر کھل جاتا ہے اور یادوں کے چراغ جلنے لگتے ہیں ۔ شاعر محبوب کو یاد دلاتا ہے اور طرح طرح سے اس کے سامنے ملاقات کے موسم اور وعدوں کے روز و شب مہکنے لگتے ہیں ۔ مومن کہتے ہیں کہ محبوب میں اور ان میں جو قرار طے پایا تھا پتا نہیں وہ محبوب کو اب یاد ہو کہ نہ یاد ہو اور اسی طرح نبھانے کے وہ وعدے بھی جو محبوب نے کبھی کیے تھے ۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ محبوب کا لطف باقی تھا، وہ کرم اور مہربانی سے پیش آتا تھا۔ شاعر کو تو یہ سب کچھ ذرا ذرا یاد ہے پتہ نہیں محبوب کا حال کیا ہے ۔ وہ زمانہ بھی تھا کہ ملتے تو نئے نئے گلے شکوہ ہوتے ، مزے مزے کی حکایتیں بیان کی جاتیں، روٹھنا منا بھی ہوتا ۔ احباب ہوں تو سب کے سامنے اشاروں میں گفتگو بھی ہوتی اور موقع ہو تو برملا بیان بھی لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ محبوب کو وہ ساری چیزیں یاد نہیں رہیں ۔ ایسے ہی موقع پر ملتے تو محبوب اپنی وفا جتانے کے لیے دوست احباب کی ملامت کا گلا بھی کرتا اور اگر کوئی بات محبوب کے جی کو بری لگتی تو ایک ادا کے ساتھ بیان سے پہلے ہی اس بات کو بھول جاتا ۔ محبوب کو کون جانے یاد ہو کہ نہ یاد ہو ۔ کیوں کہ اب تو حالات ایسا موڑ لے چکے ہیں کہ کبھی ہم کو ایک دوسرے سے محبت تھی، ہم ایک دوسرے سے آشنا تھے، شاید یہ بھی محبوب کو یاد نہ رہا ہو ۔ مومن نے نہایت عمدگی سے یہ بھی کہا کہ کئی سال پہلے محبوب نے کوئی وعدہ کیا تھا، اس وعدے کو نبھانے کا تو کیا ذکر اب تو یہ عالم ہے کہ محبوب کو شاید وہ وعدہ بھی یاد نہ ہو اور اگر کبھی کوٹھے کی کوئی بات یاد دلانی چاہی تو محبوب کا یہ کہنا کہ میری بلا جانے گویا اس کو وہ سب یاد ہے ہی نہیں ۔ اور اگر ملاقات ہو تو کسی بات کا نہ ماننا اور ہر وقت انکار کرنا، شاید یہ باتیں محبوب کے دل سے اتر گئی ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ مومن کو اب اپنا تعارف کروانا پڑتا ہے کہ وہ کبھی محبوب کا آشنا تھا اور ایسا آشنا کہ محبوب اس کو اپنے وفاداروں میں شمار کرتا لیکن آج

دہی مومنِ مبتلا کون جانے محبوب کو یاد ہے کہ نہیں۔

مومن نے سادہ زبان، بے تکلف اندازِ بیان اور خوب صورت لہجے سے اس غزلِ مسلسل کو نہایت جاذبِ توجہ بنادیا ہے کہ دوسروں کے ہاں ایسی پیاری پیاری غزل ہائے مسلسل کم ہی ملیں گی۔

●

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو غالب اور حالی کے قدرداں ہی نہیں تھے اپنے طور پر بھی ایک نام ور شاعر رہے ہیں۔ اپنے دور کے دستور کے مطابق انھوں نے غزلیں لکھیں اور ایک ممتاز غزل گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں آج بھی ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ شیفتہ جنھوں نے ایک اور تخلص حسرتی اختیار کرتے ہوئے روایتی غزل گو ہونے کے علاوہ اپنے دور کی معاشرتی اور تہذیبی صورتِ حال کی عکاسی بھی کی۔ ان کی غزلیں اس طرح اپنے دور کی مرقع نگاری کے لیے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کے کلیات میں غزلیاتِ مسلسل بھی ملتی ہیں جن سے ان کی فن کارانہ مہارت اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شیفتہ کی ایک غزلِ مسلسل درج کی جاتی ہے:

❄

پھر محرک ستم شعاری ہے
پھر انھیں جستجو ہماری ہے
پھر وہی داغ و دل سے صحبت گرم
پھر وہی چشم و شعلہ باری ہے
پھر وہی جوشِ نالہ و فریاد
پھر وہی شورِ آہ و زاری ہے
پھر خیالِ نگاہِ کافر ہے
پھر تمنّائے زخمِ کاری ہے

پھر وہاں طرزِ دل نوازی ہے
پھر یہاں رسمِ جاں نثاری ہے
پھر وہی بے قراریِ تسکیں
وہی تسکینِ بے قراری ہے
پھر جفا واں وفا ہوئی پھر یاں
ناامیدی امیدواری ہے
جس کے جور و ستم بھی یاد نہ تھے
پھر ہمیں اس کی یادگاری ہے
پھر ہمیں کام کچھ نہیں تم سے
پھر وہی وضع گر تمھاری ہے
شیفتہ پھر ہے ننگِ عزت سے
پھر وہی ہم ہیں اور خواری ہے

["کلیاتِ شیفتہ و حسرتی" مرتبہ حسبِ فرمائش نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب - تعلق دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر - ص: ۸۷ - سنِ اشاعت: ۱۹۱۶ء - مخزونہ: ادارہء ادبیاتِ اردو -]

شیفتہ نے اس مختصر بحر والی غزلِ مسلسل میں خاص طور پر لفظ "پھر" کی تکرار سے جہاں موسیقیت پیدا کی ہے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی عمدگی سے کی ہے۔ اس غزلِ مسلسل میں وہ کہتے ہیں کہ محبوب نے پھر ستم شعاری اختیار کرلی ہے اس لیے اس کو ہماری جستجو اور تلاش ہے۔ محبوب کو پھر داغ و دل سے واسطہ ہے ،اس کی شعلہ باری اور خفگی کا پھر وہی عالم ہے، ہماری نالہ و فریاد میں کوئی، کمی نہیں آئی ہماری آہ و زاری کا شور وہی ہے کہ جو تھا۔ پھر ہمارے خیالوں میں وہی کافر نگاہ ہے اور یہی تمنا کہ زخم کھائیں اور کھاتے چلے جائیں

۔ محبوب کا رویہ کہ دل نوازی لیے ہوئے اور ہمارا طریقہ کہ اپنی جان نثار کرنے پر ہر طرح مائل۔ ہم کہ تسکین کے لیے بے قرار اور وہی بے قراری کی تسکین۔ وہ کہ ہمیشہ جفا پر مائل اور ہمارا حال کہ ہم وفا شعار اسی وجہ سے ہمیشہ نارسا اور ناامید۔ ہمارا محبوب جس کے جور و ستم ہم کو یاد نہیں لیکن جس کی یاد ہم بھلا نہ پائے۔ ہمارا وہی انداز کہ تم سے کوئی کام نہ رکھیں اور محبوب کا رویّہ وہی تغافل لیے ہوئے۔ شیفتہ مقطع میں کہتے ہیں کہ ہمیں ننگِ عزت سے واسطہ ہے لیکن کیا کریں ہماری تقدیر میں جو خواری تھی سو ہے۔

•

انشاءاللہ خاں انشاء لکھنو کے منتخب اور نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ دبستان لکھنو اپنی جن خصوصیات کی وجہ سے تاریخ ادب میں یادگار ہے انشاء کی شاعری ان ساری خصوصیات کی حامل ہے۔ صنعتوں کا استعمال، مرصع اور مسجع زبان، پر شکوہ الفاظ، دور از کار تشبیہات و استعارات کا استعمال، غیر معمولی مبالغہ اور فرضی معشوق کے حسن و جمال کی باتیں اور ہجر و وصال کے بے بنیاد قصے۔ مصحفی سے انشا کے معرکوں نے ان کی شاعری کو نزاعی بنادیا۔ لیکن ان کو جو فن شعر پر مہارت تھی، جس قادر الکلامی کے وہ مالک تھے اس کی وجہ سے ان کی شاعری کی آب و تاب میں نہ تو ان کے دور میں فرق آیا اور نہ آج ان کی ہر دل عزیزی میں کوئی کمی آئی ہے۔ انشاء غزل کے شاعر تھے اور ان کا شمار ایسے غزل گوؤں میں ہوتا ہے۔ جن سے دبستان لکھنو کی شناخت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں جہاں تہاں آس پاس کے واقعات اور معاشرتی خوب و خراب کی جھلکیاں مل جاتی ہیں لیکن سچ پوچھیے تو روایتی اور ٹھیٹ غزل ان کے پاس ملتی ہے۔ اور جہاں تک تغزل کا تعلق ہے وہ تو انشاء کی غزل کا جزو لاینفک ہے۔ انشاء نے ایک بڑا شعری سرمایا چھوڑا اور بڑی خوب صورت اور دل نواز غزلیں اردو شاعری کو دیں۔ انھوں نے اپنی غزل گوئی کے ذریعے صنفِ غزل کو بھی اعتبار بخشا۔ انشاء کے ہاں کچھ زیادہ تو نہیں لیکن غزلِ مسلسل پھر بھی ملتی ہیں۔ ہر چند کہ وہی حسن و عشق کے موضوعات اور روایتی موضوعات اور انداز بیان بھی روایتی۔ یہاں ان کی یہ غزل درج کی جاتی ہے۔

❄

دیکھنا جب مجھے کر شان یہ گالی دینا
کس سے تم سیکھے ہو ہر آن یہ گالی دینا

اختلاط آپ سے اور مجھ سے کہاں کا ایسا
واہ جی جان نہ پہچان یہ گالی دینا

اب تو ناداں ہو سنا چاہو سو پیاری کہہ لو
پر تمھیں دیوے گا نقصان یہ گالی دینا

آخرش ہوگے جواں پھر تو کسے بھاوے گا
چند روز اور ہے مہمان یہ گالی دینا

تہمتِ بوسہ عبث دیتے ہو منظور جو ہو
کرکے بے فائدہ بہتان یہ گالی دینا

دیجیے دیجیے ہے عین سعادت اپنی
عاشقوں پر تو ہے احسان یہ گالی دینا

تیرے غصے سے جو انشا ہو خفا ناحق ہے
ہاں تجھے چاہیے نادان یہ گالی دینا

○

["انتخابِ سخن" سلسلہ اساتذہ متفرق - جلد یازدہم -

مرتبہ حسرت موہانی - ص: ۳۸ - سنہ اشاعت ؟؟؟ء - ناشر: ؟؟؟ -]

انشا کہتے ہیں کہ ان کے محبوب کا عالم یہ ہے کہ وہ گالی دینے کو بھی ایک شان سمجھتا ہے، نہ جانے اس نے ہر آن یہ گالی دنیا کہاں سے سیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبوب کے ان سے ایسے روابط ہی نہیں، نہ جان نہ پہچان لیکن نیک بخت گالی ضرور دیتا ہے۔ تم تو نادان ہو پھر بھی ہماری یہ بات ذہن میں رہے کہ تمھارا یہ گالی

دینا تمھارے حق میں نقصان کا باعث ہو گا، کیوں کہ آج لوگ سن رہے ہیں لیکن کل تم جوان ہو گے تو کوئی ان کو سہہ نہ سکے گا۔ گویا یہ گالی دینا چند روز کا مہمان ہے۔ تم ہم پر خواہ مخواہ تہمت تراشتے ہو لیکن یاد رکھو یہ گالی دینا تم پر ایک الزام ہو گا۔ ہاں عاشقوں پر یہ احسان ہو گا کہ تم گالی دے رہے ہو لہذا گالیاں اور دو، اور دو۔ انشاء تیرے غصے سے ناحق خفا ہے، اے نادان تجھے زیب دیتا ہے کہ تو اس کو گالیاں دیتا رہے۔

انشاء کی ایک اور غزل ہے:

❋

مل مجھ سے اے پری تجھے قرآن کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیمان کی قسم
تو ریت کی قسم قسم انجیل کی تجھے
تجھکو قسم زبور کی فرقان کی قسم
داماں کو میرے ہاتھ سے اس رات مت جھٹک
تجھکو سحر کے چاک گریبان کی قسم
تجھکو قسم ہے غنچۂ زنبق کی ناک کی
اور شور عندلیب غزلخوان کی قسم
قسمیں تو ساری ہوچکیں باقی رہی ہے اب
پیپل تلے کے بھُتنے کی ، شیطان کی قسم
ہاں پھر تو کہو ہائے وہ کس عصر ہو غضب
انشا نہ چھیڑ تجھکو مری جان کی قسم

["انتخابِ سخن" سلسلہ اساتذہ متفرق - جلد یازدہم -
مرتبہ: حسرت موہانی - ص: ۳۸ - سنہ اشاعت ۹۹۹ء - ناشر: ۹۹۹ -]

انشاء اپنے محبوب کو پری کہہ کر خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ سے مل تجھے قرآن اور تخت سلیمان کی قسم توریت، انجیل کی زبور اور فرقان کی قسم! وہ کہتے ہیں کہ اے محبوب سحر کے چاک گریباں کی قسم کہ دامن کو میرے ہاتھ سے مت جھٹک، تجھ کو نرگس اور ریحان اور گلستان کی قسم، انشاء مزید قسمیں دیتے ہوئے محبوب کو غنچہ زنبق، شور عندلیب کی اور تو اور پیپل کے تلے شیطان کی قسم بھی دینے سے وہ نہیں چوکتے۔ انشاء کو محبوب کا کہنا یاد آتا ہے کہ اے انشاء تجھ کو میری جان کی قسم کہ تو مجھے نہ چھیڑ! محبوب کا یہ انداز کچھ ایسا پیارا تھا کہ دل پر نقش ہو گیا۔

1
G M 1857 Ke1

(ج) غزلِ مسلسل ۱۸۵۷ء کے بعد

غالب اور ان کے ہم عصروں کے تذکرے کے بعد اردو غزل کا منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ اور اس وقت جس شاعر پر ہماری نظریں ٹھہر جاتی ہیں وہ ہے الطاف حسین حالی۔

حالی کو بالعموم غزل کے مخالف کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے اپنی گراں قدر تصنیف "مقدمہ شعر وشاعری" میں حالی نے غزل کی خرابیوں اور اس کے منفی اثرات کا ذکر کیا۔ ہمارے معاشرے اور معاشرت پر اردو غزل نے جو ستم ڈھائے ہیں ان کی حکایت بھی بیان کردی اور ایسا منظر سامنے لایا کہ اردو غزل سے بعض گروہ بدکنے لگے لیکن حالی کو غزل کا مخالف سمجھنا نہ تو حالی کے ساتھ انصاف ہے اور نہ غزل کے ساتھ۔ حالی نے غزل کی خرابیاں یقیناً گنوائیں اور غزل کو ہمارے معاشرے کے لیے کوئی کارآمد صنف قرار نہیں دیا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ حالی غزل کے مخالف تھے۔ سچ پوچھیے تو بہ حیثیت صنف کے حالی نے غزل کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ تو غزل کی صرف اصلاح چاہتے تھے۔ ان کو غزل کے پُروقار سرمائے کا احساس تھا۔ غالب، شیفتہ وغیرہ سے ان کے مراسم تھے۔ اپنے ہم عصر کئی شاعروں کی غزل پر ان کی نظر تھی۔ چناں چہ وہ غزل کے مخالف ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ خود حالی نے غزلیں کہیں اور خوب

صورت غزلیں کہیں۔ ایسے روایتی موضوعات پر اشعار کہے جن موضوعات کو انھوں نے ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔ حالی نے خود کو نظم گو شاعر کی حیثیت سے منوایا۔ " مدو جزر اسلام " کے علاوہ " بیوہ کی مناجات " جیسی نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن ان کی غزلوں کا سرمایہ بھی خاصا بھاری بھر کم ہے۔ نظم نگاری اپنی جگہ، انھوں نے غزلوں میں بھی جہاں تہاں تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے غزلِ مسلسل سے کام لیا ہے اور کئی خوب صورت غزلِ مسلسل کہی ہیں۔ ایک ایسی ہی غزل ہے۔

❄

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقوا
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا
جس رہ گذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر
صنعاں سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا
فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا
عقل و خرد نے تجھ کو کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا
علم و ادب رہے ہیں دلبر ترے ہمیشہ
ہر معرکہ میں تو نے ان کو ڈلا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا
اک دست رس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

["دیوانِ حالی" مصنفہ الطاف حسین حالی۔ ص: ۵۸-۵۹۔
مخزونہ: کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو۔]

اس غزلِ مسلسل میں حالی نے عشق کو موضوع بنایا ہے بلکہ یوں کہیے کہ عشق بہ طور کردار کے یہاں ابھر آتا ہے اور اس کی وجہ سے عام و خاص کو جن مصائب و آلام سے گزرنا پڑتا ہے ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ اس عشق کی وجہ سے کئی قومیں فنا ہو گئیں، جس گھر سے عشق کی ہنگامہ آرائی شروع ہوئی وہ گھر ویران ہو گیا، دوست دشمن سب عشق سے خوف زدہ ہیں اور جو بھی اس کے مقابل آیا گویا اس کا خاتمہ ہو گیا۔ عشق وہ ہے کہ جس کی زد میں آکر مہاراجاؤں کے راج ختم ہوئے، بادشاہوں کے تاج گرے اور وہ لوگ جو فخر و غرور سے رہتے تھے، گردنوں کو اکڑی رکھتے تھے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ کیا دولت مندوں کی دولت اور کیا زاہدوں کی عبادت و تقویٰ، عشق نے جس کو نشانہ بنایا وہ الٹ گیا، جس رہ گزر میں عشق کا سامنا ہوا لوگ وہاں کا راستہ بھول بیٹھے۔ یہ عشق ہی ہے جس کی وجہ سے فرہاد نے اپنی جان گنوائی اور قیس عامری مجنوں بن کر

جنگل جنگل پھرا۔ حضرت یعقوب جیسے صالح انسان بے صبری کا شکار ہوئے اور حضرت یوسف جیسے نیک اور پاک صاف انسان پر تہمتیں اٹھائی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عشق کے لاگ اور لگاؤ دونوں دلوں کو نرم کردیتے ہیں اور پتھر دل بھی ہوں تو عشق کی وجہ سے رونے لگتے ہیں۔ عقل و خرد کا پوچھنا ہی کیا، جب بھی وہ عشق کی راہ میں آئے ان کی ہستی فنا ہو گئی۔ علم و ادب نے بھی تیری بالادستی قبول کی اور ہر معرکہ میں تیری جیت رہی۔ عشق وہ ہے جس کا افسانہ رنگین اور داستاں دل کش ہے کہ شعر و سخن میں جب بھی اس کا ذکر ہوا جادوئی کشش محسوس ہوئی۔ عشق کا نشانہ کون نہیں بنا، ایک حالی تھا کہ عشق کی مار سے بچا ہوا تھا لیکن عشق نے اس کو بھی اپنا نشانہ بنا کر چھوڑا۔

•

امیر مینائی ممتاز اساتذہ، سخن میں رہے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو نکھارنے اور سنوارنے میں غیر معمولی حصہ ادا کیا غزل کی روایات سے انھوں نے اپنا رشتہ کم زور نہ کیا ہو لیکن اپنی انفرادیت کی چھاپ غزل پر ثابت کی۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں رنگِ زمانہ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں لیکن عمومی موضوعات کی کمی نہیں۔ ان کی مرتبت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ دبستانِ امیر بجائے خود اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے ان کے ہاں جو غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں وہ چند ایک سہی لیکن امیر کے معیار اور مرتبے کی غماز ہوتی ہیں۔ ان چند ایک غزلیاتِ مسلسل میں سے دو ایک یہاں درج کی جاتی ہیں۔

❄

سو دل فدائے صاحبِ فرمانِ رامپور
ہے رام پور جسم وہ ہے جانِ رامپور
بالا ہے قاف سے بھی کہیں شانِ رامپور
زلفِ پری ہے سایہ، ایوانِ رامپور
غازہ بنائیں لے کے جو پائیں بتانِ چین

رنگِ شکستہ ، چمنستانِ رامپور

محوِ خرامِ ناز نسیم و صبا نہیں
گلگشت کر رہے ہیں حسینانِ رامپور

گلیاں یہاں کی باغِ ارم کی ہیں کیاریاں
رضواں ہے باغبانِ گلستانِ رامپور

نرگس کے پھول گرد یہ انگور کے نہیں
ہیں دخترِ رز کی تاک میں مستانِ رامپور

آشفتگی یہاں کی ہے طرہ بہار پر
زلفِ بتاں ہے خوابِ پریشانِ رامپور

کونین کے مزے ہیں بشر کو یہاں نصیب
دونوں جہاں سے سیر ہیں مہمانِ رامپور

اہلِ نظر کو ملتی ہے آنکھوں میں یاں جگہ
اللہ چشمِ بد سے نگہبانِ رامپور

چکر میں بے سبب نہیں دن رات آسماں
کرتا ہے مہر و ماہ کو قربانِ رامپور

شہنا کی بام سے نہیں آتی ہے یہ صدا
زہرہ ہے آسماں پہ ثنا خوانِ رامپور

سائے پہ فرطِ نور سے عالم ہے دھوپ کا
ہے آفتاب شمسہ ، ایوانِ رامپور

بھولیں گے خلد میں نہ ان کے ادا و ناز

G M 1857 Ki

یاد آئیں گے وہاں بھی حسینانِ رامپور

لاتے نہیں خیال میں شاہانِ دہر کو

حضارِ بارگاہِ سلیمانِ رامپور

حصہ امیر کو بھی ملے خوانِ جود سے

مہماں نواز یہ بھی ہے مہمانِ رامپور

["صنم خانۂ عشق" باہتمام، مولوی محمود احمد صاحب انور مینائی۔

مطبع، امیر المطابع حیدرآباد دکن۔ ص، ۸۱ - سنہ اشاعت، ۱۳۳۲ ہجری -

مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو۔حیدرآباد۔]

اس غزلِ مسلسل میں رامپور کے تعلق سے امیر کی وابستگی اور حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں فرماں روائے رامپور پر ہم سو جان سے فدا ہیں۔ رامپور اگر جسم ہے تو فرماں رو اس کی جان ہے کوہ قاف سے بھی زیادہ رامپور کی شان ہے کیوں کہ رام پور کے ایوان پر پری کی زلف کا سایا ہے۔ رامپور کے چمن کا رنگ شکستہ سہی لیکن آج بھی بتانِ چین ان کو پائیں تو اپنے چہرے کا غازہ بنالیں۔ یہ جو نسیم و صبا چل رہے ہیں حق تو یہ ہے کہ حسینانِ رامپور چمن میں گلگشت کر رہے ہیں۔ یہاں کی گلیاں گویا باغِ ارم کی کیاریاں ہیں اور رضوان گلستانِ رامپور کی باغ بانی کر رہا ہے۔ انگور کے اطراف یہ نرگس کے پھول نہیں بلکہ مستانِ رامپور دختِ رز کی تاک میں ہیں۔ یہاں جوشِ عشق عروج پر ہے اور حسینوں کی زلف گویا خواب پریشاں کی طرح ہے۔ یہاں تو انسان کو کونین کے مزے حاصل ہیں، جو یہاں سیر کو آیا گویا اس نے دو جہاں کی سیر کرلی۔ اگر اہلِ نظر ہو تو انھیں آنکھوں میں جگہ ملتی ہے۔ یہ جو آسمان ہے بلاوجہ گردش میں نہیں بلکہ یہ چاند سورج کو رامپور پر قربان کر رہا ہے۔ یہ جو بام سے شہنائی کی صدا آرہی ہے شہنائی کی صدا نہیں یہ تو زہرہ ہے جو آسمان پر رامپور کی ثنا خوانی کر رہی ہے۔ یہ جو نور کی زیادتی سے دھوپ کا عالم ہے یہ گویا رامپور کا ایوان آفتاب سے جگمگا رہا ہے۔ ہم تو وہ ہیں کہ جنت میں بھی حسینانِ رامپور کو یاد رکھیں گے۔ ہم تو صرف رامپور کے حکم رانوں کے ثنا خواں ہیں، ہم تو دنیا کے بادشاہوں کو

GM 1857 k

بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ آخر میں امیر کہتے ہیں کہ ہم بھی تو مہمانِ رامپور ہیں، ہمیں بھی یہاں کی سخاوت سے استفادہ کرنا ہے۔

امیر کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایہ ء دیوار قیصر باغ میں

سبزہ ء خوابیدہ کیسا آ گیا جو خفتہ بخت
اس کے طالع ہو گئے بیدار قیصر باغ میں

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزارِ جنت سے نہیں
حوریں پھرتی ہیں سرِ بازار قیصر باغ میں

ہر روش پر چل رہی ہے ایسی صحت کی ہوا
چشمِ نرگس تک نہیں بیمار قیصر باغ میں

پاؤں کا یاں ذکر کیسا، صاف ہے ایسی زمیں
دل پھسلتے ہیں دمِ رفتار قیصر باغ میں

بند جب ٹوٹیں شکستِ توبہ کی آئے صدا
لیں اگر انگڑائیاں مے خوار قیصر باغ میں

لوٹتا پھرتا ہے یہ مارے خوشی کے صبح و شام
وجد میں ہے سایہ ء دیوار قیصر باغ میں

یہ اشارہ نہر میں کرتی ہے ہر انگشتِ موج
سب کا ہو جائے گا بیڑا پار قیصر باغ میں

چار نغموں میں ہو سعدی کی گلستان کا جواب
بلبلیں کھولیں اگر منقار قیصر باغ میں
زیرِ شاخِ گل اگر سبزہ کبھی سونے لگا
شورِ بلبل نے کیا بیدار قیصر باغ میں
اتنے پتے بھی نہ ہونگے گلشنِ فردوس میں
جس قدر پھولوں کے ہیں انبار قیصر باغ میں
تشنگانِ شوق ہیں شیریں لبوں کے میہمان
بٹ رہا ہے شربتِ دیدار قیصر باغ میں
قطرے شبنم کے رگِ گل پر دکھاتے ہیں بہار
گُندھ رہے ہیں موتیوں کے ہار قیصر باغ میں
کہہ رہی ہے یہ صنوبر قامتوں سے فاختہ
آؤ بھی بہرِ علمبردار قیصر باغ میں
آتے آتے لب تلک بن جائے بقعہ نور کا
کھینچیے گر آہِ آتش بار قیصر باغ میں
نخلِ گل ہے ہر تماشائی زہے فیضِ بہار
پھول جھڑتے ہیں دمِ گفتار قیصر باغ میں
موجہ ء مےَ کی نسیمِ صبح میں تاثیر ہے
بے صبوحی مست ہیں ہشیار قیصر باغ میں
اب دلِ مایوس بے برگی سے افسردہ نہ ہو
لائے گا نخلِ تمنا بار قیصر باغ میں

دور ہونگی کلفتیں ، مٹ جائیں گی سب کاہشیں
لالہ ہے بیداغ ، گل بے خار قیصر باغ میں

سایہ ، بالِ ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے امیر
بیٹھ زیرِ سایہ ، دیوار قیصر باغ میں

[" صنم خانہ ، عشق " باہتمام، مولوی محمود احمد صاحب انور مینائی۔ مطبع، امیر المطابع حیدر آباد دکن۔ ص، ۱۳۷-۱۳۸ - سنہ اشاعت، ۱۳۳۲ ہجری - مخزونہ ادارہ ، ادبیات اردو - حیدر آباد۔]

قیصر باغ کی تحسین میں ایسی غزل شاید ہی کہی گئی ہو۔ محبوب کے حوالے سے امیر کہتے ہیں: کس کے رخسار کی قیصر باغ میں چمک ہے کہ یہاں کے سایہ ، دیوار میں بھی چاندنی چٹکی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سبزہ ، خوابیدہ کیسا آ گیا کہ سوئی ہوئی قسمت والے بھی روشن تقدیر ہوگئے۔ یہ جو حور جیسی حسینائیں قیصر باغ میں پھر رہی ہیں تو لگتا ہے کہ یہ خطّہ گل زارِ جنت سے کم نہیں۔ عالم یہ ہے کہ ہر طرف صحت افزا ہوائیں ہیں، چشمِ نرگس بھی بیمار نہیں۔ یہاں کی زمین ایسی صاف ہے کہ پاؤں ہی کیا دل بھی پھسل جاتے ہیں اور اگر مے خوار انگڑائیاں لیں تو بند بھی ایسے ٹوٹیں کہ شکستِ توبہ کا گمان ہو۔ سایہ ، دیوار بھی لگتا ہے وجد میں ہے اور خوشی سے صبح و شام لوٹتا پھرتا ہے۔ موجِ یہ نوید دیتی پھر رہی ہے کہ سب کا بیڑہ قیصر باغ میں پار ہوجائے گا اور سب لوگ کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔ اگر یہاں کی بلبلیں منقار کھولیں تو چار نغموں میں سعدی کی گلستان کا جواب دے لیں۔ شاخِ گل کے نیچے اگر کبھی سبزہ سونے لگے تو بلبل شور یوں کرتا ہے کہ وہ جاگ جائے۔ امیر کہتے ہیں قیصر باغ میں پھول اس قدر زیادہ اور اتنے ہیں کہ گلشنِ فردوس میں اتنے پتے بھی نہ ہوں گے۔ عاشق مزاج یہاں کی حسیناؤں کے مہمان ہیں اور شربت دیدار ہے کہ قیصر باغ میں بٹ رہا ہے۔ شبنم کے قطرے پھولوں پر اپنی بہار دکھا رہے ہیں گویا موتیوں کے ہار گوندھ رہے ہوں۔ یہاں فاختہ اونچے قد والی حسیناؤں سے کہہ رہی ہیں کہ قیصر باغ میں آؤ۔ اور اگر کوئی آہِ آتش بار کھینچے تو لب تک آتے آتے نور کا

روپ اختیار کرلے۔ فصلِ بہار کا یہ عالم ہے کہ کوئی بات بھی کرتا ہے تو اس کے منھ سے پھول جھڑتے ہیں نسیمِ صبح میں شراب کی تاثیر ہے اور ہشیار لوگ بھی پیے بغیر مست ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے دل مایوس اور افسردہ نہ ہو کہ قیصر باغ میں تمنائیں بر آئیں گی، یہاں سب کی مصیبتیں دور ہوں گی کیوں کہ یہاں تو لالہ بے داغ ہے اور گل بے خار۔ اب لوگوں کو سایہء بالِ ہما ڈھونڈنے ضرورت نہیں کیوں کہ قیصر باغ کی دیوار کا سایہ بالِ ہما سے کم نہیں۔

●

حالی کے مقدمہء شعر و شاعری اور ان کی نظم نوازی کی وجہ سے اردو غزل پر جو ایک حد تک ضرب پڑی اس کا احوال بتانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور میں غزل مزاج شعراء نہ ہوتے اور خاص طور پر داغ تو اردو غزل کا مستقبل کون جانے کیا ہوتا۔ داغ اردو غزل کی وہ قد آور شخصیت ہے جس نے زبان و بیان، محاورات، استعارات، تشبیہات اور موضوعات سے اردو غزل کو ایک بار پھر اردو شاعری کی آبرو بنادیا۔ آج بھی اردو غزل جس شان و شکوہ اور تمطراق کی حامل ہے اس میں داغ کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ٹھیک ہے داغ کے موضوعات کا لب و لہجہ روایتی اور ہمارے بہت سے کلاسیکی شاعروں کا آزمایا ہوا ہے۔ لیکن اس امر سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ داغ نے اپنے موضوعات اسلوب اور لب و لہجے سے اردو غزل کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ داغ پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری عصری حیثیت اور زمانے کے سرد و گرم سے عاری اور محض حسن و عشق اور ہجر و وصال کی شاعری ہے۔ لیکن داغ کے دواوین کا سیر حاصل مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے خوب و خراب، انتشار و اختلال اور جمود و زوال کی تصویریں بھی نہایت خوبی کے ساتھ کھینچی ہیں۔ داغ کا سارا سرمایا تقریباً غزل پر مشتمل ہے کہ انھیں صرف غزل کے شاعر ہی کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے غزلیاتِ مسلسل بھی کہی ہیں لیکن کچھ زیادہ نہیں۔ ان کے ہاں جو چند مسلسل غزلیں ملتی ہیں ان میں سے ایک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

I:
G M 1857 K

❄

مرے جاتے ہیں تیری بے وفائی دیکھنے والے
چراغِ صبح ہیں شامِ جدائی دیکھنے والے
ہمیں ٹھہرے ترے اک اک برائی دیکھنے والے
رکھائی ، بے وفائی ، کج ادائی دیکھنے والے
رہے حیرت میں تیری آشنائی دیکھنے والے
برائی دیکھنے والے ، بھلائی دیکھنے والے
یدِ بیضا جو چمکا کر دکھائیں حضرتِ موسیٰ
نہ دیکھیں ہم ترا دستِ حنائی دیکھنے والے
سنیں کیوں لن ترانی ، طور پر کیوں جائیں ، کیا حاصل
کہ مستغنی ہیں تیری خود نمائی دیکھنے والے
ہماری جان کی پروا ہے کس کو دیکھ اے قاتل
بہت ہیں بات کی تیرے صفائی دیکھنے والے
کہاں ہے اب ترا ثانی ذرا انصاف سے دیکھیں
مری آنکھوں سے تیری دل ربائی دیکھنے والے
اس آئینے کا جوہر اور ہی جلوہ دکھاتا ہے
مرا دل دیکھ عارض کی صفائی دیکھنے والے
ہوا کیوں نبض میری دیکھ کر اے چارہ گر سکتہ
غضب ہے کیا تجھے بھی موت آئی دیکھنے والے
بلائیں شاخِ گل کی باغ میں جاجا کے لیتے ہیں

تصور میں تری نازک کلائی دیکھنے والے
ہوا سے اڑ گئی ہو گی کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے
بجا ہے تو نے کب چلمن اٹھائی دیکھنے والے
کیا ہے تو نے قتلِ عام اے سفاک کچھ ایسا
پھرا کرتے ہیں گلیوں میں صفائی دیکھنے والے
بھلائی سے تیری ہم کو غرض ہے وہ عدو ہوں گے
برائی سننے والے یا برائی دیکھنے والے
ترے تیرِ نگہہ کی کیا دلوں پر چوٹ پڑتی ہے
یکایک دینے لگتے ہیں۔ دہائی دیکھنے والے
مرے سینے میں چشمِ جنگجو نے کچھ نہیں چھوڑا
صفائی ہوگئی دیکھیں لڑائی دیکھنے والے
جھجکتا کیوں ہے میرے قتل سے کیا سخت جاں ہوں میں
لگا تو ہات اے نازک کلائی دیکھنے والے
ملی تھی آنکھ میری روزنِ در سے کہ وہ بولے
بھلا دیکھا ہے تیری شامت آئی دیکھنے والے
وہ سو پردوں میں بھی بیٹھیں تو ہرگز چھپ نہیں سکتے
وہاں تک کر ہی لیتے ہیں رسائی دیکھنے والے
یہ مظہر ہے اسی کا داغ جو کچھ تو نے دیکھا ہے
خدا پر رکھ نظر شانِ خدائی دیکھنے والے

| "یادگارِ غالب" دیوانِ چہارم - مرتب، سید علی احسن صاحب مارہروی -

GM 1857 K

ص ۱۵۶، ۱۵۷ - بہ فرمائش شیخ الہی بخش محمد جلال الدین تاجرانِ کتب لاہور۔
مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد۔

داغ کہتے ہیں کہ تیری بےوفائی سے جنھیں سابقہ پڑا ہے، لگتا ہے وہ لوگ اب اپنی زندگی کے دن پورے کررہے ہیں۔ شامِ جدائی گذارنے والوں کی حیثیت چراغِ سحر کی ہے جو اب بجھا کہ تب بجھا۔ لیکن ہم ایک ایسے ہیں کہ ہم تیری ہر اک برائی کو دیکھ چکے ہیں تیری رکھائی، بےوفائی اور کج ادائی سب ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ جن سے تیری آشنائی رہی خواہ وہ برائی دیکھنے والے ہوں یا بھلائی سب محوِ حیرت ہیں۔ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ ہمیں اگر حضرتِ موسیٰ یدِ بیضا چمکا کر بتادیں تب بھی ہم اس کو نہ دیکھیں کیوں کہ ہم تیرا دستِ حنائی دیکھ چکے ہیں۔ نہ ہمیں لن ترانی سننے کی اور نہ طور پر جانے کی خواہش ہے کیوں کہ ہم تیری خودنمائی دیکھ کر اس میں محو ہیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہوچکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اے قاتل ہم کو اپنی جان کی بھی پروا نہیں ہم تو بس تیرے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ داغ اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ تیرے جیسا اور کوئی نہیں، ہم تو بس تیری دل ربائی دیکھنے والے ہیں۔ ہمارا دل مثالِ آئینہ ہے جو جلوے ہی جلوے دکھاتا ہے۔ تیری عارض کی صفائی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ہماری ڈوبتی ہوئی نبض دیکھ کر چارہ گر بھی سکتے میں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم کو مرتا دیکھ کر وہ بھی مرچکا ہے۔ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ اپنے دوست کی نازک کلائی کے تصور میں باغ میں جاجا کے شاخِ گل کی بلائیں لیتے ہیں۔ وہ جو تیرے گھر کی چلمن اٹھی ہے وہ یقیناً تو نے نہیں اٹھائی لگتا ہے ہوا کی وجہ سے اڑ گئی ہو۔ تو نے کچھ اس خوبی کے ساتھ قتلِ عام کیا ہے کہ تیرے ہاتھ کی صفائی دیکھنے والے گلیوں میں پھرا کرتے ہیں۔ ہم کو تو صرف تیری بھلائی سے غرض ہے، ہم وہ نہیں کہ دشمن کی طرح برائی دیکھنا یا سننا چاہتے ہوں۔ تیرے تیرِ نگاہ کی دلوں پر ایسی چوٹ پڑتی ہے کہ دیکھنے والے دُہائی دیتے ہیں۔ میرے سینے کا عالم یہ ہے کہ تیری جنگ جو آنکھوں نے کچھ نہیں چھوڑا، لڑائی دیکھنے والے محسوس کریں گے کہ منظر صاف ہوچکا ہے۔

داغ کہتے ہیں کہ اے محبوب تو میرے قتل سے کیوں جھجھکتا ہے تیری کلائی نازک صحیح لیکن بس

تیرے ہاتھ لگانے کی دیر ہے۔ روزنِ در سے میری آنکھ لگی ہی تھی کہ وہ بولے اب تیری شامت آگئی ہے۔ محبوب تو سو پردوں میں چھپ کر چاہتا ہے کہ لوگ اس کو نہ دیکھیں مگر لوگ وہاں تک بھی رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ آخر میں داغ کہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی ہے کہ شانِ خدائی دیکھنا دراصل خدا کو دیکھنا ہے۔ داغ کی اور مسلسل غزلیں بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔

○●○

GM 20

(باب۔ پانچ)

غزلِ مسلسل بیسویں صدی میں

◆◆◆

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی اقبال کی صدی ہے۔ اقبال نظم گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اور یہ بات ہے بھی درست کہ اقبال کی نظمیں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن اقبال اپنی غزل گوئی کی وجہ سے بھی ایک اونچے مقام کے حامل ہیں لیکن انھوں نے اردو غزل کی روایات سے مکمل انحراف کیا ہے۔ ان کی غزلیں نہ وہ سرشاری لیے ہوئے ہوتی ہیں اور نہ ان میں تغزل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ غنائیت سے بھی وہ بہت کم ہی واسطہ رکھتی ہیں حالاں کہ ان کی نظموں میں غنائیت کہیں زیادہ ملتی ہے۔ لیکن اقبال نے اپنی غزل کو مسائلی غزل کا روپ دے دیا ہے۔ وہ غزل میں حسن و عشق کی باتیں اور روایتی موضوعات سے برائے نام کام لیتے ہیں اس کے برعکس انھوں نے غزلوں کو نظموں کی طرح زندگی کے مسائل کی دھڑکنوں کا حامل بنا دیا ہے اور یہ ان کی نظم گوئی ہی کا اثر ہے کہ ان کی کئی غزلوں میں ربط و تسلسل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں نظموں کی تعداد تو خیر ہے ہی زیادہ لیکن نظموں کی کیفیت لیے ہوئے کئی غزلیں جن کو غزلِ مسلسل کہنا چاہیے ان کے ہاں ملتی ہیں۔ بلکہ بعض غزلِ مسلسل تو ایسی ہیں جنھیں عنوان دے دیا جائے تو وہ نظم کہلائیں۔ یہاں ایک ایسی ہی غزل پیش کی جاتی ہے جس کو "عشق" کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ غزل ہے:

❄

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا !

کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا !

وہ عشق جس کی شمع بجھادے اجل کی پھونک

اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا !

میری بساط کیا ہے ؟ تب تابِ یک نفس

شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا !

کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا

پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بےقرار کا !

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو

یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

["بالِ جبرئیل" ناشران: اردو پاکٹ بک سیریز۔ دہلی۔ ص ۷۔

سنہ اشاعت: ۱۹۶۳ء ۔ مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔]

یہ غزل کیا ہے از اول تا آخر عشق اور اس کی مختلف کیفیات کی ترجمان ہے۔ عشق کیا ہے کیا ہونا چاہیے اس کی حقیقت و حیثیت کیا اور اس کا کردار۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہماری زندگی مانگی ہوئی ہے اور ظاہر ہے ایک محدود مدت کے لیے اور ذاتِ الٰہی ازل سے ابد تک۔ ظاہر ہے ہماری ناپائدار زندگی کا ذاتِ الٰہی کی پائدار اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہستی سے عشق کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ہمارا عشق کیا ہے موت نے اگر ایک پھونک ماری تو ہماری زندگی کی شمع بجھ جائے ایسی ناپائدار، کم ثبات اور آنی و فانی حیات کا عشق اپنے میں کوئی لطف و مزا نہیں رکھتا۔ انسان کی حقیقت ہی کیا ہے۔ بس ایک دو لمحوں کی چمک دمک۔ ہم تو ایک چنگاری جیسے ہیں اور ذاتِ الٰہی شعلے جیسی۔ ایک چنگاری بھلا شعلے سے کیا الجھے گی۔ ہاں اگر ہمارے ذوق و شوق اور انتظار و تڑپ اور

دل کی بے چینی و بے کلی تو دیکھنا ہو تو ہمیں اللہ ایک جاوداں زندگی عطا کرے تاکہ ہم بھی اپنے ذوق و شوق کا اظہار کر سکیں۔ عشق تو ایسا ہونا چاہیے جو ہمیشہ بے چین رہے اور بے چینی رکھے، ایک کانٹے کی طرح جس کی کھٹک لازوال ہو، ایک درد کی طرح جس کی کسک لازوال ہو۔ اس ساری غزلِ مسلسل میں اقبال نے عشق کے بیان سے ندرت پیدا کر دی ہے اور عشق کے مفہوم کو کچھ ایسی دل بری سے بیان کیا ہے کہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اقبال کی ایک اور غزل مسلسل بھی کچھ ایسی ہی ہے بلکہ اس غزلِ مسلسل کو اگر عنوان "فقر" دے دیا جائے تو اس کو ایک نظم قرار دینے میں تکلف نہ ہو گا۔ ملاحظہ ہو غزلِ مسلسل:

❄

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم ، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جو یائے راہ فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر ، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب ، علم میں مستی گناہ
علم کا موجود اور ، فقر کا موجود اور
اشھد ان لا الہ ، اشھد ان لا الہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو

GM 20$

تیری نگہ توڑدے آئینہ مہر و ماہ

["بالِ جبرئیل" ناشران: اردو پاکٹ بک سیریز۔ دہلی۔ ص: ۶۱۔
سنہ اشاعت: ۱۹۶۳ء ۔ مخزونہ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد۔]

اقبال نے اس غزلِ مسلسل میں فقر کی ہیئت اس کے مقصود اور علم سے اس کے رشتے اور وجہ امتیاز کو انتہائی شاعرانہ لیکن حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ فقر ایک اہم اور وقیع ایمانی قوت ہے اور صاحبِ فقر صاحبِ ایمان ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تاج و تخت یہ اسلحہ و سپاہ سب فقر کے معجزات ہیں اور کچھ نہیں۔ فقر کا کام وہ ہے کہ اس کو سرداروں کا سردار اور بادشاہوں کا بادشاہ کہیے۔ علم ظاہری چیز ہے اور فقر سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ علم کا مقصود تو صرف عقل و فہم کی پاکی ہے جب کہ فقر کا مقصود قلب و نگاہ دونوں کی عصمت و پاکیزگی۔ علم کی حیثیت فقیہہ کی ہے وہ حکیم جیسا ہے لیکن فقر کا مرتبہ مسیح و کلیم کے برابر ہے، گویا فقر پیغمبرانہ صفت ہے۔ علم راستے کو ڈھونڈتا ہے لیکن فقر ہے کہ وہ راستوں کی حقیقت جاننے والا ہے۔ علم ہم کو صرف اطلاع بہم پہنچاتا ہے جب کہ فقر ہم کو وہ نظر دیتا ہے جس سے ہم چیزوں کی حقیقت جان سکیں۔ فقر میں مستی ایک نیکی ہے جب کہ علم میں مستی گناہ ہے۔ جس علم اور فقر دونوں کا وجود جداگانہ ہے۔ اقبال یہاں کہتے ہیں کہ شہادت دیتا ہوں کہ اور کوئی نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ جب صاحبِ فقر صاحبِ خودی ہوجاتا ہے تو ایک سپاہی ایک بھاری بھرکم فوج کا مقابلہ کرلیتا ہے کربلا میں یہی تو ہوا۔ ایسے میں دل اگر بیدار اور زندہ ہو تو چاند ستاروں پر بھی فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔

اقبال کی ان دونوں غزلوں سے اندازہ ہوگا کہ ان کے ہاں غزلِ مسلسل اپنے زیادہ صحیح معنی و مفہوم میں ملتی ہے۔ نظم گو شاعروں میں ان کی اعلیٰ مرتبت تو ہے ہی غزلِ مسلسل کہنے والوں میں بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔ اقبال کے ہاں غزل ہائے مسلسل کی کمی نہیں خود بالِ جبرئیل میں کئی غزلیں مل جائیں گی۔ یہاں دو ایک کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں۔

❋

GM205

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن !

["بالِ جبرئیل" ناشران اردو پاکٹ بک سیریز - دہلی - ص: ۳۶ -
سنہ اشاعت: ۱۹۶۳ء - مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد -]

❄

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

["بالِ جبرئیل" ناشران اردو پاکٹ بک سیریز - دہلی - ص: ۳۷ -
سنہ اشاعت: ۱۹۶۳ء - مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد -]

●

نواب حیدر یار جنگ بہادر علی حیدر طباطبائی نظم شاعر ہیں ہی لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسے عالم ہیں کہ جن کو کہنے والوں نے بحرالعلوم قرار دیا ہے۔ نظم طباطبائی اپنے تخلص کے اعتبار سے نظم گو شاعر ہیں خصوصاً ان کا "گرے" کی نظم کا ترجمہ "گورِ غریباں" اردو کے شعری سرمائے میں غیر معمولی وقعت و وقار رکھتا ہے۔ طباطبائی کے ہاں غزلیں بھی ہیں لیکن ان کی نظم نگاری متاثر کرتی ہے۔ ان کے ہاں ایسی کئی نظمیں مل جائیں گی جو موضوعات کی ندرت کے علاوہ اسلوب کی چاشنی کی وجہ سے دل کشی کی حامل ہیں۔ ان کے ہاں غزلیاتِ مسلسل بھی ملتی ہیں جن میں انھوں نے ایک ہی موضوع کو تسلسلِ خیال کے ساتھ کام میں لاتے ہوئے سماں پیدا کر دیا ہے۔ ایسی ہی ایک غزلِ مسلسل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

❄

مجھ کو سمجھو یادِ رفتگانِ لکھنو
ہوں قدِ آدم غبارِ کاروانِ لکھنو

GM 20S

خونِ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنو
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنو
گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنو
میرے ہر آنسو میں اک آئینہ ، تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرزِ فغانِ لکھنو
ڈھونڈھتا ہے اب کسے لے کر چراغِ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنو
لکھنو جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنو باقی نہ شانِ لکھنو
اب نظر آتا نہیں وہ مجمع اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنو
پہلے تھا اہلِ زباں کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیے تھی تیغِ اردو کو فسانِ لکھنو
مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو اتنوں میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنو
یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمع دود مانِ لکھنو
چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع
سجدہ کرتے تھے اسے گردن کشانِ لکھنو

عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں میں نے چوسی ہے زبانِ لکھنو

گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنو

بوئے انس آتی ہے حیدر خاکِ مٹیا برج سے
جمع ہیں اک جا وطن آوارگانِ لکھنو

[" دیوانِ حیدر طباطبائی " مرتبہ :سلسلہء مطبوعات
مکتبہء ابراھیمیہ ۔ ص: ۱۸۵ ۔ سنِ اشاعت : ۱۹۳۳ ۔ ناشر: انجمن
امدادِ باہمی مکتبہء ابراھیمیہ ۔ حیدر آباد دکن ۔]

●

عزیز لکھنوی دبستانِ لکھنو کے ممتاز شاعر ہیں۔ اردو غزل کو سہارا دینے میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ لکھنو کا وہ جو روایتی شاعرانہ ڈکشن ہے وہ عصرِ حاضر کے بیش تر لکھنوی شاعروں کے پاس شاید ہی ملے تاہم جن شاعروں نے لکھنوی آداب و انداز کی پیروی برقرار رکھی ہے عزیز لکھنوی کا نام ان ہی میں آتا ہے۔ ویسے انھوں نے لکھنوی طرز سے تھوڑا بہت انحراف کرتے ہوئے اپنی انفرادیت پیدا کی ہے۔ عزیز کے ہاں غزلیاتِ مسلسل بھی مل جاتی ہیں چناں چہ ان کے مجموعہ ، غزلیات " انجم کدہ " سے یہ ایک غزلِ مسلسل ملاحظہ ہو۔

❄

دل کشتہ ، نظر ہے ، محرومِ گفتگو ہوں
سمجھو مرے اشارے ، میں سرمہ در گلو ہوں

مدت سے کھو گیا ہوں ، سرگرمِ جستجو ہوں
اپنا ہی مدعا ہوں ، اپنی ہی آرزو ہوں

G M 20 Sa

صورت سوال ہوں میں ، پوچھو نہ میرا مطلب
میں اپنے مدّعا کی ، تصویر ہو بہ ہو ہوں

ہے دل میں جوشِ حسرت رکتے نہیں ہیں آنسو
رستی ہوئی صراحی ، ٹوٹا ہوا سبو ہوں

زخموں سے دل کا عالم ، کیا پوچھتے ہو کیا ہے
گل زارِ بے خزاں ہوں ، دنیائے رنگ و بو ہوں

جلوے حجاب افگن ، آنکھیں ہلاکِ حسرت
تم محوِ پردہ داری ، میں وقفِ جستجو ہوں

پامال یوں ہوا ہوں پنہاں ہے مجھ میں عالم
اک مشتِ خاک ہوکر صحرائے آرزو ہوں

رخ سے کفن ہٹا دو ، کیا پوچھتے ہیں پوچھیں
پردے میں خامشی کے سرگرمِ گفتگو ہوں

کس سے عزیز رکھوں امید دوستی کی
سرکش ہے نفس جب تک ، اپنا ہی میں عدو ہوں

["انجم کدہ" مجموعہ غزلیات - عزیز لکھنوی - ص: ۳۱-۳۲
سنہ اشاعت: مارچ ۱۹۵۶ء - ناشر: انجمن ترقی اردو ہند - علی گڑھ -
مطبوعہ: سرفراز پریس - لکھنو]

عزیز کہتے ہیں: میں اپنے محبوب کی نظر کا مارا ہوا ہوں اور گفتگو سے عاجز بھی ہوں۔ گویا میں سرمہ، در گلو ہوں، اس لیے اشاروں ہی سے مجھ کو سمجھا جائے۔ میں مدت سے کھویا ہوا ہوں لیکن مجھے اپنی تلاش بھی ہے۔ عجب بات ہے کہ میں اپنا مدعا بھی آپ ہوں اور اپنی آرزو بھی۔ میرا مطلب کیا پوچھتے ہو کہ میں خود صورتِ

سوال ہوں اور میرا پیکر ہی میرے مدعا کی ترجمانی کررہا ہے۔ میرے دل میں حسرتوں کے جوشش کا یہ عالم ہے کہ میرے آنسو رکتے نہیں، میری مثال پھوٹے ہوئے پیالے اور رستی ہوئی صراحی سے دی جاسکتی ہے جس سے ہمہ وقت پانی رستا رہتا ہے۔ جو مجھے زخم لگے ہیں ان کی وجہ سے میں اپنے دل کا عالم کیا بیان کروں کہ زخموں کے خون کی وجہ سے میں گل زار بنا ہوا ہوں جو خزاں سے بے نیاز ہے اور جس کی اپنی ایک دنیائے رنگ و بو ہے۔ جلوئے شرم و حجاب کو اور بڑھارہے ہیں، میری آنکھیں حسرتوں کا مدفن ہیں تم پردہ داری میں محو ہو اور میں انھیں ڈھونڈنے سرگرداں۔ میں یوں پامال ہوا ہوں اور مجھ میں ایک عالم ایسے پنہاں ہے کہ میں مٹھی بھر مٹی ہوکر بھی آرزوؤں کا صحرا بنا ہوا ہوں۔ میرے چہرے سے کفن ہٹاؤ تو اندازہ ہوگا کہ میں خاموشی کے پردے میں بھی محوِ گفتگو ہوں۔ میں اوروں سے دوستی کی کیا امید رکھوں کہ میرا سرکش نفس ہی میرا دوست نہیں دشمن بنا ہوا ہے۔

•

جوش ملیح آبادی بیسویں صدی کے ممتاز اور نام ور اردو شعرا میں شمار ہوتے ہیں شاعرِ شباب اور شاعرِ انقلاب ہر دو حیثیتوں سے ان کی مرتبت بلند ہے۔ جوش معروف تو نظم نگار شاعر کی حیثیت سے ہوئے چناں چہ ان کی انقلابی ہوں کہ رومانی کئی نظمیں معرکتہ الآرا ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ غزل کے کٹر مخالفوں میں جوش کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ یہ نہیں کہ جوش نے غزل کی مخالفت کی بلکہ غزل کی مخالفت میں ان کے کئی مضامین اور دل چسپ واقعات ملتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ جوش نے اپنی شاعری کی ابتدا، نہ صرف غزل سے کی بلکہ آگے چل کر دھوم دھام کی غزلیں بھی کہیں اور کہتے رہے۔ اور تو اور جوش کی کہی ہوئی کئی ایک طرحی غزلیں بھی ملتی ہیں جو انھوں نے ہندستان اور بعد میں پاکستان منتقل ہونے پر مشاعروں میں پڑھیں۔ مزید دل چسپ بات یہ ہے کہ جوش کی ساری انقلابیت اور ان کے مزاج کی گرمی ان غزلوں میں کہیں بھی آشکار نہیں ہوتی۔ ان کے بعض شعری مجموعوں میں غزلیں ملتی ہیں اور بعض میں کچھ زیادہ ہی جیسے "شعلہ و شبنم" میں "بادہ، سرجوش" عنوان کے تحت جدید رنگِ تغزل اور قدیم رنگِ

تغزل کے ذیل میں کئی غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ جوش نے نظم نگاری میں جو بھی انداز اپنایا ہو ان کی غزلیں اردو کی کلاسیکل اور روایتی غزلوں کا رنگ روپ لیے ہوتی ہیں۔ وہی حسن و عشق کی باتیں، ہجر و وصال کے قصے، گل و بلبل کے افسانے اور سنبل و نسرین کی حکایات۔ سچ پوچھیں تو غزل دشمنی کے باوجود جوش کا غزل سے یہ لگاؤ دبستانِ لکھنو کی دین ہے، اور اس ماحول کا اثر جس میں جوش کی شعری و ادبی شخصیت کی ساخت و پرداخت ہوئی۔ وہ نہایت حلاوت آمیز اور گھلی ہوئی زبان میں غزل کہتے ہیں اور غزل کے سارے لوازمات کے ساتھ تغزل جس کو جانِ غزل کہنا چاہیے جوش کی غزلوں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر جوش کی غزلوں کا سرمایہ کچھ زیادہ نہیں لیکن ان کے ہاں اور شاعروں کے مقابلے میں نسبتاً کہیں زیادہ غزلِ مسلسل ملتی ہے۔ اس کی وجہ اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ نظم کے شاعر ہونے کی وجہ سے تسلسلِ فکر اور ارتکاز کے عمل کو اپنانے کے لیے وہ از خود مائل ہوتے ہیں۔ شعلہ و شبنم میں شامل غزلوں کا جائزہ لیں تو کئی غزلیاتِ مسلسل کی بہ آسانی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ جیسے یہ غزل ہے:

❄

صبر کر اے دل کہ پھر وہ شاہِ خوباں آئے گا
پھر ترے پہلو میں یارِ فتنہ ساماں آئے گا
یوں نہ آہیں بھر کہ پھر اس خلوتِ خاموش میں
اک نہ اک دن یار رقصاں و غزل خواں آئے گا
جان، اے ناعاقبت اندیش! رو رو کر نہ دے
کیا کرے گا پیش جب وہ مالکِ جاں آئے گا
دھو نہ بام و در کی نقاشی کہ پھر اس قصر میں
گنگناتا قاصدِ شمعِ شبستاں آئے گا
شل نہ کر شانوں کو ماتم سے کہ کل اس راہ میں

لہر کھاتا کاروانِ زلفِ پیچاں آئے گا
سرو و سنبل کی نگہہ داری سے ، غافل ہوشیار
اس چمن میں پھر پیامِ ابرو باراں آئے گا
سبزہ ، خوابیدہ کو سر سبز رکھ ، اے باغباں
پھر پئے گل گشت وہ سروِ خراماں آئے گا
سر نگوں ہیں گل تو کیا پروا کہ پھر وہ لالہ رخ
صد گلستاں برکف و صد گل بداماں آئے گا
تہہ نہ کر اے جوش ، فرشِ بادہ خواری تہہ نہ کر
کل یہیں گردش میں پھر جامِ زر افشاں آئے گا

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص، ۲۶۲۔
سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء ۔ ناشر، ہمالیہ بک ہاؤس ۔]

اس غزل کا موضوع قطعی رومانی اور روایتی حسن و عشق کا ہے۔ حتیٰ کہ جوش نے جو اعتراضات صنفِ غزل پر کیے ہیں ان کی اس غزل اور ایسی اور غزلوں پر بلا تکلف عائد کیے جاسکتے ہیں۔ اس غزل میں جوش اپنے دل کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب یارِ فتنہ ساماں پھر آئے گا، اے دل تو آہیں نہ بھر کہ اس خلوتِ خاموش میں ایک بار پھر محبوب رقصاں و غزل خواں ہو گا۔ رو رو کر جان دینے سے کچھ حاصل نہیں وہ مالک جاں بر حق ہے بہر کیف ادھر کا رخ کرے گا۔ وہ جو بام و در کی تزئین کی گئی ہے اس کو دھونے کی ضرورت نہیں کہ محبوب یقین ہے گنگناتا ہوا شبستاں کی رونق بنے گا۔ ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہیں کہ وہ اپنی زلفوں کو لہراتا ہوا آئے گا۔ سرو و سنبل کی نگہہ داری سے ہوشیار رہ، اس چمن میں پھر بارش ہوگی اور بہار آئے گی۔ سبزہ، خوابیدہ کو سر سبز رکھ کہ وہ جانِ عزیز سرو خراماں پھر گل گشت کے لیے ادھر نکلے گا۔ پھول اگر مرجھائے گئے ہیں تو کوئی پروا نہیں کہ محبوب جب آئے گا تو اپنے ہاتھوں میں سو سو گلستاں لیے ہوئے۔ آخر میں

جوش کہتے ہیں کہ بادہ خواری ترک کرنے کی ضرورت نہیں کہ پھر جامِ درخشاں گردش میں آنے والا ہے۔

جوش کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

اے ہم نشیں! یہ قصہ ء دہشت فزا نہ پوچھ
دل کس طرح بنا دلِ بے مدعا نہ پوچھ

غارت گروں کی سُستیِ پیماں دلا نہ یاد
سنگیں دلوں کے وعدہ ء صبر آزما نہ پوچھ

لب ہائے ناز کے سخنِ ناسزا نہ سن
چشمِ سیاہ کے ستمِ ناروا نہ پوچھ

قصہ ہے دردناک دلِ داغ داغ کا
کیوں کر " یہ ماہتاب " بنا ہے " سہا ؟ " نہ پوچھ

طے کر چکا ہوں عشق کی جس راہِ صعب کو
اس راہ کی کشاکشِ بیم و رجا نہ پوچھ

اب تک وہ دل میں آگ بھری ہے کہ الاماں
کس طور سے یہ خاک بنی کیمیا ؟ نہ پوچھ

پہلو سے اپنے جوش کو تاروں کی چھاؤں میں
آتی ہے کس نگار کی آوازِ پا ؟ نہ پوچھ

[" شعلہ و شبنم " جوش ملیح آبادی۔ ص: ۳۳۸۔
سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء۔ ناشر: ہمالیہ بک ہاؤس۔]

جوش اس غزل میں ہم نشین سے مخاطب ہیں کہ یہ دہشت فزا قصہ نہ چھیڑا جائے کہ دل کس طرح دلِ

G M 20 Sad

بے مدعا بنا۔ جوش نہیں چاہتے کہ غارت گروں کی سُستیِ پیماں کو یاد کریں اور نہ سنگ دلوں کے وعدہ، صبر آزما پر بھروسا کریں۔ وہ محبوب کے ناسزا سخن اور چشمِ سیاہ کے ستمِ ناروا کا ذکر نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں دلِ داغ دار کے دردناک قصے کو نہ پوچھا جائے۔ وہ جو عشق کی راہِ مصیبت تھی اس میں بیم و رجا تھی، جس کشمکش سے گزرنا پڑا اس کا کہنا لا حاصل۔ اب تو دل میں آگ بھری ہوئی ہے لیکن اس کا تذکرہ کیوں۔ آخر میں جوش کہتے ہیں کہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ محبوب ان کے ساتھ تھا اور اب بھی اس کی آوازِ پا آرہی ہے۔

اس کے علاوہ جوش کی یہ مسلسل غزلیں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں:

❄

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آج کل
پھر دستِ شوق و دامنِ جاناں ہے آج کل

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص: ۲۷۶۔]

❄

ہاں اس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ
ایمان ڈھل نہ جائے گا، صرف ایک بار دیکھ

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص: ۱۹۳۔]

❄

جواں ہوں ہر چند، پھر بھی چہرہ ہے جوش بے آب و تاب میرا
مری عروسِ سخن کے رخ پر جھلک رہا ہے شباب میرا

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص: ۳۱۵۔]

❄

بہتر تو یہی ہے ہنستا رہ، تو کوہ ہے، خود کو کاہ نہ کر

G M 20 Sad
1

یہ بن نہ پڑے تو کم سے کم ، خاموش ہی رہ ، اور آہ نہ کر

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص، ۳۲۳۔]

افشائے رازِ عشق کا ساماں کیے ہوئے
پھر آگئے وہ بال پریشاں کیے ہوئے

["شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی۔ ص، ۳۳۳۔]

اختر شیرانی اپنے ہم عصروں میں غیر معمولی انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ چند ایک اشعار سے قطعِ نظر وہ کلیتہً حسن و عشق اور ہجر و وصال کے شاعر ہیں۔ انھوں نے زندگی کو ہمیشہ صرف ایک نظر سے دیکھا اور وہ نظر محبت کی نظر ہے۔ ان کی شاعری روایتی انداز کی نہیں کہی جاسکتی کہ انھوں نے کئی زاویوں سے اردو کی شعری روایات سے بغاوت کی ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ان کا محبوب طبقہ، نسواں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں محبوب کو مذکر قرار دینے کا جو رواج تھا اختر شیرانی نے اس سے روگردانی کی۔ ان کی محبوب مستورات سے ہے۔ جس کو انھوں نے کہیں سلمیٰ کہیں اور کچھ نام دیا ہے۔ قدرت کے نظاروں، مئے ارغوانی کی بوتلوں اور محبوب کے خد و خال کو انھوں نے اپنی دنیا تصور کیا اور اسی دائرے میں ان کے شعر و شاعری کے خطوط پھیلتے ہیں۔ اختر شیرانی نے غزلیں اور نظمیں سب کہیں اور اپنی نظموں میں خاص طور پر حسن و عشق کی نئی نئی کیفیتوں کو پیش کیا۔ لیکن ان کی غزلیں بھی اسی طرح دل کشی اور دل آویزی کا باعث ہیں۔ انھوں نے نظمیں ہوں کہ غزلیں اپنی دنیا آپ بسائی ہے اور نہایت سلونے انداز سے۔ نظمیں تو خیر نظمیں ہیں غزلوں میں بھی انھوں نے اپنے محبوب اور محبت کا ذکر کرتے ہوئے ان کو غزلِ مسلسل کی حیثیت دے دی ہے۔ کلیاتِ اختر شیرانی میں کئی ایک غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں، وہی رومان کی دنیا بسائے ہوئے۔ یہاں ان کی دو غزلِ مسلسل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پہلی غزلِ مسلسل ہے:

✽

دل و دماغ کو رولوں گا ، آہ کرلوں گا
تمھارے عشق میں سب کچھ تباہ کرلوں گا

اگر مجھے نہ ملیں تو ، تمھارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کرلوں گا

مجھے جو دیر و حرم میں کہیں جگہ نہ ملی !
ترے خیال ہی کو سجدہ گاہ کرلوں گا

جو تم سے کردیا محروم ، آسماں نے مجھے !
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کرلوں گا

" رقیب " سے بھی ملوں گا ، تمھارے حکم پہ میں
جو اب تلک نہ کیا تھا وہ آہ کرلوں گا

تمھاری یاد میں ، میں کاٹ دوں گا حشر سے دن
تمھارے ہجر میں راتیں سیاہ کرلوں گا

ثواب کے لئے ہو جو گنہ وہ عین ثواب
خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کرلوں گا

حریمِ حضرتِ سلمٰی کی سمت جاتا ہوں
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کرلوں گا

یہ نو بہار ، یہ ابرو ، ہوا ، یہ رنگِ شراب
چلو جو ہو سو ہو اب تو گناہ کرلوں گا

کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اختر

جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کرلوں گا

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۲۸۳-۲۸۵ - سنہ اشاعت : ندارد -

ناشر: نیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۷۳۹ دہلی -

مخزونہ : ادارہ ادبیاتِ اردو -]

اختر شیرانی محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، میں آہیں کرتے ہوئے اپنے دل و دماغ کو ماؤف کرلوں گا، تمھارے عشق میں مجھے اپنی ہر چیز کی تباہی منظور ہے۔ اگر تم مجھے نہیں ملوگی تو مجھے تمھارے سر کی قسم میں اپنی ساری جوانی کو تباہ کرلوں گا۔ مجھے دیر و حرم کی کوئی پرواہ نہیں مجھے وہاں جگہ ملے نہ ملے مجھے تو تیرا خیال ہی کافی ہے اسی کو میں اپنا سجدہ گاہ بناؤں گا۔ اگر تم مجھے نہ حاصل ہو تو میں اپنی زندگی گناہوں میں صرف کرلوں گا۔ میں نے تو جواب تلک نہ کیا وہ بھی کرنے کو تیار ہوں یعنی تمھارے حکم پر مجھے رقیب سے ملنا بھی گوارا ہے۔ میں تمھاری یاد میں قیامت کے سے دن بھی کاٹ لوں گا اور جدائی کی راتیں سیاہ کرلوں گا۔ میں سمجھتا ہوں ثواب کے لیے اگر کوئی گناہ کیا جائے تو عین ثواب ہے چناں چہ میں خدا کے نام پر بھی ایک گناہ کرلوں گا۔ میں سلمٰی کے گھر کی سمت جاتا ہوں، کوشش کروں گا کہ ضبط کروں ورنہ چپکے سے آہ بھی کرلوں گا یہ نئی نئی بہار، یہ بادل، یہ مست ہوائیں اور یہ شراب کا رنگ، خواہ کچھ ہوجائے میں نے تو اب گناہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ میں تو اپنے محبوب کے عشق میں اپنی جوانی ہی کیا اپنی ساری زندگی تباہ کرنے کی ٹھان چکا ہوں۔

اختر شیرانی کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❋

جھوم کر آئی ہے مستانہ گھٹا برسات کی
جی لبھاتی ہے نسیمِ جاں فزا برسات کی
باغ کا ایک اک شجر ہے اک عروس سبز پوش
جس کو آ کر گدگداتی ہے ہوا برسات کی

G M 20 Sad

رحمتِ حق ، ابر بن کر چار جانب چھا گئی
کب سے کرتے تھے دعائیں مہ لقا برسات کی
کوئلیں کوکیں ، پپیہے پی کہاں کہنے لگے
نغموں سے لبریز ہے رنگیں فضا برسات کی
جھولتی ہیں تتلیوں کی طرح کم سن مہوشیں
یا شگوفوں کو اڑاتی ہے ہوا برسات کی
اک طرف پھولوں کی آنکھوں میں امنڈ آئی بہار
اک طرف رنگت دکھاتی ہے حنا برسات کی
سر سے ڈھلکے ہیں دوپٹے ، بال بکھرے سر کھلے
چھیڑتی ہے نازنینوں کو ہوا برسات کی
شاخساروں سے ملہاروں کی صدا آنے لگی
کیا سہانے گیت گاتی ہے گھٹا برسات کی
دل مچلتا ہے مرا اختر گھٹا کو دیکھ کر
آہ ! یہ کالی ، یہ متوالی گھٹا برسات کی

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۳۳۲-۳۳۳ - سنہ اشاعت: ندارد -
ناشر: نیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۴۳ دہلی -
مخزونہ: ادارہ ادبیاتِ اردو -]

اختر شیرانی یہاں موسمِ برسات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ برسات کی مستانہ گھٹا جھوم کر آئی ہوئی ہے ، ہوائیں ایسی جاں فزا ، ایسی روح کو تراوٹ بخشنے والی اور جی کو لبھانے والی ہیں کہ کہا نہیں جاسکتا ۔ وہ کہتے ہیں باغ کا ایک ایک پیڑیوں ہرا بھرا ہے جیسے کوئی دلہن ہو اور ہوائیں ایسی لگتی ہیں کہ اس دلہن کو

گدگدا رہی ہیں۔ یہ ابر ابر نہیں بلکہ لگتا ہے رحمتِ حق ہے جو چاروں جانب چھا گئی ہے، کرنے والے تو بہت دیر سے برسات کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ اب تو موسم بھی حسین ہو گیا ہے، کوئلیں کوک رہی ہیں پپیہے بھی پی کہاں کی رٹ لگا چکے ہیں اور نغموں سے برسات کی فضا رنگین ہو گئی ہے۔ نوخیز اور کم سن لڑکیاں تتلیوں کی طرح جھول رہی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسات، شگوفوں کو اڑا رہی ہے۔ برسات ہی کا فیض ہے کہ پھولوں کی آنکھوں میں بہار اُڈ آئی ہے تو اسی کے ساتھ مہندی بھی اپنا رنگ دکھاتے ہوئے برسات کی فضا کو اور رنگین بنا رہی ہے۔ موسمِ برسات میں جدھر دیکھیے حسینائیں ہیں، ڈوپٹے ان کے سر سے ڈھلکے ہوئے، بال بکھرے ہوئے اور سر کھلے ہوئے، برسات کی ہوائیں ان نازنینوں کو چھیڑ رہی ہیں۔ شاخساروں سے ملہار کی صدائیں آ رہی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے برسات کی ہوائیں سہانے گیت گا رہی ہیں۔ اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے اختر شیرانی کہتے ہیں برسات کی گھٹاؤں کو دیکھ کر میرا دل مچلنے لگتا ہے۔ یہ کالی اور متوالی گھٹائیں عجب مزا دے جاتی ہیں۔

کلیاتِ اختر شیرانی میں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں، جن میں سے چند کے مطلع درج کیے جاتے ہیں۔

مستانہ پیے جا، یونہی مستانہ پیے جا
پیمانہ تو کیا چیز ہے مے خانہ پیے جا

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۲۸۶ - مخزونہ: ادارہ ادبیاتِ اردو۔]

آتی ہے جھومتی ہوئی بادِ بہارِ عید!
مستِ طرب ہے آج ہر اک میگسارِ عید

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۲۹۷ - مخزونہ: ادارہ ادبیاتِ اردو۔]

لیلیٰ عشق کو درکار ہیں دیوانے چند
نجد میں پھر نظر آنے لگے ویرانے چند

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۳۱-۳۰۰ - مخزونہ : ادارہ ادبیاتِ اردو -]

❄

سوئے کلکتہ جو ہم بادلِ دیوانہ چلے
گنگناتے ہوئے اک شوخ کا افسانہ چلے

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۳۶۱-۳۶۲ - مخزونہ : ادارہ ادبیاتِ اردو -]

❄

بھلاؤ گے بہت لیکن تمھیں ہم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیں گے پھر بھی بہت ہی یاد آئیں گے !

["کلیاتِ اختر شیرانی" ص: ۵۲۲ - مخزونہ : ادارہ ادبیاتِ اردو -]

●

فانی بیسویں صدی کے ان چند شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو غزل کی آبرو نہ صرف برقرار رکھی بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ فانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ان کی زندگی ہے اور زندگی ان کی غزل۔ انھوں نے جس بانکپن اور طرح داری کے ساتھ غزل گوئی کی ہے ایسی مثال کم ہی ملے گی۔ یہ سچ ہے فانی کا رنگِ سخن اور لہجہ بدلا ہوا ہے۔ وہ اپنے موضوعات اور اسلوب کی وجہ سے یاسیت کے امام کہے جاتے ہیں لیکن اس امر کو بھی نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے کہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں :

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

○

فانی نے اپنی شاعری کو یاسیت کا مرقع بناتے ہوئے اپنے عہد کے تقاضوں کی عکاسی کی ہے۔ وہ جو مایوسی اور حزن و ملال کی کیفیت ان کے اشعار میں ملتی ہے وہ دراصل ان کے عہد کا مزاج ہے۔ فانی نے دیگر اصناف میں محض برائے نام کہا ہے ان کے ہاں غزل مزاج ہونے کی وجہ سے غزلِ مسلسل بھی کم ہی ملے گے لیکن وہ جو چند ایک ہیں ان سے غزلِ مسلسل کے کھلتے ہوئے رنگ و روپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی ہی غزلِ مسلسل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

❄

اے زمینِ لکھنو اے آسمانِ لکھنو
تم سے رخصت ہو رہا ہے میہمانِ لکھنو
گرچہ یہ آوارہ ۔ ملک و وطن کچھ بھی نہیں
تھا مگر منجملہ دلدادگانِ لکھنو
گرچہ اس ناخواندہ مہماں کی نہ تھی خاطر عزیز
بے تکلف تھا یہ خاکِ آستانِ لکھنو
الوداع اے سبزہ و فوارہ و حوض و چمن
رخصت اے جوشِ بہار بے خزانِ لکھنو
رخصت اے بام و در ہر کاخ و ایواں الوادع
الوداع اے لکھنو اے مردمانِ لکھنو
داغ ہے دل پر تری آزردگیِ بے سبب
الوداع اے خاطرِ نامہربانِ لکھنو
جمع ہیں دونوں جہاں اپنے دلِ رنجور میں
اک جہانِ آرزو ہے ۰ اک جہانِ لکھنو

شکوہ ان بے مہریوں کا گو نہیں اصلا ہمیں
ہاں مگر اتنا رہے خاطر نشانِ لکھنو
بے مروت! یوں تو سب ہیں چاہنے والے ترے
کم ہیں فانی کی طرح شیدائیانِ لکھنو

["انجم کدہ" مجموعہء غزلیات۔ عزیز لکھنوی۔ ص ۳۱-۳۲
سنہ اشاعت مارچ ۱۹۵۶ء ۔ناشر انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔
مطبوعہ سرفراز پریس۔ لکھنو]

فانی لکھنو کے زمین و آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں لکھنو کے مہمان کی حیثیت سے آیا تھا اور مہمان ہی کی طرح رخصت ہو رہا ہوں۔ ہر چند کہ میں آوارہ، ملک و وطن ہوں لیکن مجھے لکھنو کے دلدادگان میں شمار کیا گیا۔ اگرچہ میں ناخواندہ مہمان تھا، جس کی خاطر عزیز نہ تھی لیکن میں یہاں کی خاکِ آستاں میں بے تکلف رہا۔ فانی لکھنو کے سبزہ و حوض اور چمن ہی سے نہیں لکھنو کی بہارِ بے خزاں کے جوش سے بھی رخصت چاہتے ہیں۔ یہاں کے بام و در، طاق و ایواں اور مردمان لکھنو سے بھی وداع چاہتے ہیں اور کہتے ہیں تیری بے سبب آزردگی کے باعث دل پر داغ لگ گیا ہے۔ اے خاطرِ نامہرباں تجھ کو الوداع! میرے دلِ غم زدہ میں دونوں جہان جمع ہیں، ایک جہانِ آرزو تو دوسرا جہانِ لکھنو۔ کہتے ہیں ہرچند کہ بے مہریوں کا شکوہ مناسب نہیں مگر اتنا یاد رہے کہ تیرے اور کئی چاہنے والے تجھ سے بے مروت رہے لیکن فانی ایک ایسا شیدائی ہے جو ہمیشہ لکھنو پر اپنی جان قربان کرتا آیا۔

•

حسرت اپنی طرح کے شاعر ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو غزل جن سے سرخ رو ہوئی ہے ان ہی فانی، اصغر، شاد، فراق وغیرہ کے ساتھ حسرت کا نام بھی برابر کی اہمیت رکھتا ہے۔ سیاست سے اپنی وابستگی اور اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے حسرت نے اردو غزل پر اسی قدر توجہ دی جتنی ہمارے اور غزل گو

شاعروں نے دی ہے۔ حسرت کی غزل کا رنگ بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری روایتی اور خیالی شاعری نہیں،ان کے ہاں تصنع کارفرما نہیں بلکہ انھوں نے اپنے عشقیہ جذبات کو سیدھے سادھے انداز میں دو ٹوک ظاہر کردیا ہے۔ ان کا محبوب بھی کوئی فرضی محبوب نہیں جس کے تذکرے سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ بلکہ انھوں نے گوشت پوشت کے انسان سے محبت کی اور ہجر و وصال کے ان شب و روز سے گزرے جن سے کہ ایک عاشق گزرتا ہے۔ اردو شاعری میں ایک عرصے تک کچھ تو فارسی شاعری کے اثر سے محبوب کا ذکر مذکر کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ لیکن مومن کے پاس روایت بدل جاتی ہے کہ انھوں نے محبوب کو نہ صرف مونث ظاہر کیا بلکہ مومن کا محبوب پردہ نشین بھی ہے اور اس تہذیبی طبقے سے وابستہ جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سامنے آیا۔ حسرت کا زمانہ کچھ اور آگے کا ہے۔ انھوں نے کسی رو رعایت کے بغیر اپنے محبوب کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ حسرت کا محبوب پردہ نشین اور انھیں کی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ حسرت کے یہاں کئی غزلیں ہیں جن میں ایسے محبوب کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے دیوانِ حسرت میں ایسی غزلوں کی کمی نہیں۔ وہ جو ان کی مشہور غزل ہے وہ تو اور زاویوں کے علاوہ غزلِ مسلسل کے ذیل ہی میں ایک کامیاب غزل قرار دی جائے گی۔ یہ غزل ہے:

❄

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہوجانا مرا

اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتہً
اور دوپٹے سے ترا وہ منھ چھپانا یاد ہے
جان کے سونا تجھے ، وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر ، وہ مسکرانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
جب سوا میرے تمھارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے
میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے

جب منالینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ

مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے وست و پا ہونا ترا

اور مرا وہ چھیڑنا وہ گد گدانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے

آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

["دیوانِ حسرت" حصۂ دوم - ص: ۱۲۷ - ۱۲۸ -

شائع شدہ رسالہ تمدن لکھنو - نومبر ۱۹۱۶ء

مخزونہ: لائبریری اردو ہال - حمایت نگر - حیدر آباد -]

اس غزل میں حسرت اپنی عاشقی کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بھی کیا دن تھے کہ ہم رات دن آنسو بہایا کرتے تھے۔ عجیب اضطراب، اشتیاق کا زمانہ تھا وہ زمانہ کہ جب ہم نے محبوب سے دل لگایا تھا۔ جب ہماری نظر اس طرف اٹھتی تو محبوب غرفے سے ہم سے آنکھیں لڑاتا اور جب ملاقات ہوتی تو حسرت کا بے باک ہوجانا اور محبوب کا دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جانا یاد آتا ہے۔ تہذیبی تقاضے تھے کہ محبوب ملتا بھی تو پردے کے پیچھے سے، جب شاید پردے کا کونا کھینچ دیتا تو محبوب کا دوپٹے سے منہ چھپانا یاد آتا ہے۔ یہ سمجھ کر کہ محبوب سویا ہوا ہے حسرت کا پابوسی کا ارادہ ہے۔ لیکن فوراً ہی سر کو ٹھکرادینا کیسے بھولا جاسکتا ہے۔ اگر اکیلے میں اتفاقاً ملاقات ہوجائے تو شاعر کا اپنا حال دل سنانا یاد آتا ہے۔ کیا زمانہ تھا کہ محبوب غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف راتوں کو چوری چھپے آتا اور وصل کی شب میں کہیں ذکرِ فراق آجاتا تو خود بھی روتا اور حسرت کو بھی رلاتا۔ دو پہر کی دھوپ کا وہ منظر بھی بھولا نہیں جاسکتا جب شاعر کو بلانے کے لیے محبوب کوٹھے پر ننگے پاؤں آتا اور دھوپ کی شدت برداشت کرلیتا۔ حسرت کو آج بھی وہ راز و نیاز کی صحبتیں یاد ہیں

اپنا جانا اور اس کا بلانا اور محبوب کا میٹھی میٹھی نرالی پیار کی باتیں چھیڑکر ذکرِ دشمن کو باتوں میں اڑانا بھی خوب تھا۔ کبھی حسرت کو برگشتہ پانے پر تو سو سو ناز سے ان کو منانا اور منالینے پر خود محبوب کا روٹھ جانا بھی عجیب چیز تھی۔ حسرت کہتے ہیں کہ ہر چند مدتیں گزر گئیں لیکن جہاں ہم چوری چھپے ملتے تھے وہ ٹھکانا آج تک یاد ہے۔ اور جب محبوب اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگالیتا تو گویا بے دست و پا ہوجاتا اور حسرت کو موقع مل جاتا کہ اس کو چھیڑیں اور گدگدائیں۔ حسرت کہتے ہیں کہ یہ سب عہدِ ہوس کی باتیں تھیں اور تقوے کے دعوے کے باوجود آج تک یہ باتیں یاد ہیں۔

•

اردو میں صوفی شعراء کون ہیں اور کون نہیں اس کے قطعِ نظر تصوف اور صوفیانہ معاملات اور مسائل پر ہمارے کئی شاعروں نے خوب خوب اظہارِ خیال کیا ہے۔ چناں چہ ایسے شاعر بھی ہیں جنھوں نے تصوف برائے شعر گفتن کہتے ہوئے اپنے کلام میں تصوف کی آمیزش کی۔ ان زاویوں سے دیکھیں تو اصغر گونڈوی کی شاعری کچھ اور نظر آتی ہے۔ اصغر نے شاعری کی لیکن ان کا اصل عشق تصوف سے تھا۔ ان کی زندگی بھی کچھ صوفیانہ رنگ ڈھنگ کی حامل رہی۔ ان کے کلام میں جو تصوف کے رنگ ملتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں وہ اصغر کی زندگی کے عکس ہیں۔ اصغر نے شاعری کم کی اور تصوف سے زیادہ کام لیا۔ اصغر کا تقریباً سارا شعری سرمایہ غزل پر مشتمل ہے، جس میں تصوف کے رنگوں نے قوسِ قزح کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ اصغر کے ہاں غزلِ مسلسل ہی ملتی ہے۔ لیکن یہی کہ شاعر کا مقصود نہ غزل کہنا ہے نہ غزلِ مسلسل بلکہ اپنے صوفیانہ مزاج کی تسکین۔ " سرودِ زندگی " میں ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے:

❄

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
ہم اس کو دیں اسی کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں

مگر خود عشق کو اس سے بھی بے پروا سمجھتے ہیں
کبھی ہیں محوِ دید ایسے سمجھ باقی نہیں رہتی
کبھی دیدار سے محروم ہیں اتنا سمجھتے ہیں
یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں
کبھی گل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر
کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں
یہاں تو ایک پیغامِ جنوں پہنچا ہے مستوں کو
اب ان سے پوچھئے دنیا کو جو دنیا سمجھتے ہیں
یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں
کبھی تو جستجو جلوے کو بھی پردہ بتاتی ہے
کبھی ہم شوق میں پردے کو بھی جلوا سمجھتے ہیں
خوشا وہ دن کہ حسنِ یار سے جب عقل خیرہ تھی
یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں
کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر
کبھی ذرے میں گم ہوکر اسے صحرا سمجھتے ہیں
یہ ذوقِ دید کی شوخی وہ عکسِ رنگِ محبوبی
نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں
نظر بھی آشنا ہو نشہ ، بے نقش و صورت سے

GM 20 Sa

ہم اہلِ راز سب رنگینیِ مینا سمجھتے ہیں

وہ نکہت سے سوا پنہاں وہ گل سے بھی سوا عریاں
یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ کبھی جلوا سمجھتے ہیں

یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی
پھر اسس شدت کی تابانی کو ہم پردا سمجھتے ہیں

دکھا جلوہ وہی غارت کُن جانِ حزیں جلوہ
ترے جلوے کے آگے جان کو ہم کیا سمجھتے ہیں

زمانہ آرہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

["سرودِ زندگی" اصغر حسین اصغر۔ ص: ۹۹-۱۰۰-۱۰۱-تاریخِ غزل:
نومبر ۱۹۳۳ء - ناشر: تاج کمپنی لمیٹڈ-لاہور-کراچی-ڈھاکہ-
مخزونہ: کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو-حیدرآباد-]

اصغر کہتے ہیں کہ حسن جب بے نقاب ہوتا ہے تو کیسی کیسی اور کن کن صورتوں میں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور کبھی اس کے جلوہ دکھانے کے باوجود ہم حیرت زدہ رہتے ہیں اور دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ پاتے گویا اس کا جلوہ ہی اس کا پردہ ہوجاتا ہے۔ ہم اس کو کبھی دین سمجھتے ہیں تو کبھی حاصلِ دنیا اور عشق کو ان، سب سے بے نیاز۔ عالم تو یہ ہے کبھی ایسے محوِ دید رہتے ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا اور کبھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم محرومِ دیدار ہیں۔ محبوب کا عالم کچھ ایسا ہے کہ اس نے ہمارے ہاتھ سے شراب کا پیالہ لیا اور توڑ ڈالا لیکن چوں کہ ہم مزاج محبوب سے واقف ہیں اس لیے ایسی باتوں کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ ہمارا عالم بھی عجیب ہے، کبھی اس چہرے کو پھول کہہ دیتے ہیں اور کبھی عالمِ مستی میں پھول کو بھی رخ زیبا متصور کرتے ہیں۔ مستوں کو تو دیوانگی کا اک پیغام پہنچا ہے، وہ لوگ جو دنیا کو دنیا سمجھتے ہیں ان کی اپنی باتیں

الگ ہیں۔ اصغر کہتے ہیں ہماری کائنات بہت سمٹی ہوئی ہے۔ یہی تھوڑی سی شراب اور یہی چھوٹا سا مےخانہ مگر ہم انھیں کے سہارے کائنات کی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ کبھی جستجو کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جلوہ بھی نظروں سے غائب رہتا ہے اور کبھی پردہ ہی جلوہ بن جاتا ہے۔ وہ دن بھی تھے کہ محبوب کو دیکھ کر عقل حیران تھی لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب محرومیوں کی باتیں تھی۔ کبھی دیوانگی کچھ ایسی طاری ہوتی کہ صحرا بھی بے حقیقت دکھائی دیتا اور کبھی ذرہ میں بھی صحرا کا جلوہ دیکھ لیتے ہیں۔ کبھی وہ ذوق دید اور وہ رنگ محبوبی، کہ نہ جلوہ نہ پردہ نہ محبوب، ان سب سے بے نیاز اصغر کہتے ہیں کہ نظر کو بھی کبھی بے نقش و صورت نشے سے آشنا ہونا چاہیے کیوں کہ ہم وہ اہل راز ہیں جو مینا کی رنگینیوں سے واقف ہیں۔ محبوب کا عالم یہ ہے کہ کبھی نکہتوں میں چھپ گیا اور کبھی پھولوں میں ظاہر ہوا، کبھی ہمارے لیے جلوہ بنا اور کبھی پردہ۔ اور پھر جلوے بھی کیسے فراواں، ارزاں اور عریاں کہ ہم ان کی شدت کی تابانی کو پردے پر محمول کریں۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو میری جانِ حزیں کو غارت کرنے والا جلوہ دکھا کہ تیرے آگے ہم اپنی جان ہی کو بے حقیقت اور ارزاں متصور کرتے ہیں۔ اصغر کہتے ہیں کہ اُن کی ان باتوں کو سمجھنے کا زمانہ آرہا ہے لیکن ابھی تو شاعر خود ہی کہہ رہا ہے اور خود ہی سمجھ رہا ہے۔ اور اسی لیے وہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

•

جگر کو امام المتغزلین کہا گیا ہے۔ جگر نے ہر چند کہ تھوڑی بہت نظم نگاری بھی کی ہے لیکن نظم جگر کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں رہی۔ وہ صرف اور صرف غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں غزلوں میں مسائلی اشعار بھی ملتے ہیں جن سے ان کی عصری حسیت بھی واضح ہوتی ہے لیکن جگر نے حسن و عشق کے موضوعات پر جتنی بھرپور غزلیں کہی ہیں اتنی بھرپور غزلیں صرف چند ہی غزل گو شاعروں کے پاس ملیں گی۔ جگر غزل کو اپنی زندگی بنا لیتے ہیں اور اپنی زندگی کو غزل، چناں چہ ان کی شاعری مجموعی طور پر لفظی اور معنوی دونوں زاویوں سے غزل کی شاعری ہے۔ جگر کی مشاعروں میں مقبولیت کا باعث بھی یہی تھا کہ انھوں نے انسانوں کے لطیف جذبات کو چھیڑا اور انھیں الفاظ کا پیرہن دیتے ہوئے غزلوں میں پیش کر دیا۔ جگر کی شاید ہی کوئی غزل ہوگی جو اس

دعوے کی تصدیق نہ کرتی ہو۔ جگر نے ایسے موضوعات پر عام نوعیت کی غزلیں ہی نہیں کہیں بلکہ ان کے ہاں غزلِ مسلسل بھی ملتی ہے۔ ایک ایسی ہی غزلِ مسلسل ہے:

❊

ملاکے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے
تجھے قسم، جو مجھے پاک باز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کرچکوں تجھ کو
یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے
ترے ہی شیوہ عاشق کشی کی تجھ کو قسم
اسی طرح مژہ ہائے دراز رہنے دے
ہٹا نہ سینہ، عاشق سے رخ کسی جانب
نگاہِ ناز کو نشتر نواز رہنے دے
گلے سے تیغ ادا کو جدا نہ کر قاتل
ابھی یہ منظرِ راز و نیاز رہنے دے
یہ تیرِ ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا
خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
قتیلِ غمزہ، خوں ریز ہوں قصور معاف
اشارہ، نگہہِ دل نواز رہنے دے!
بجھا نہ آتشِ پنہاں کرم کے چھینٹوں سے
دلِ جگر کو مجسّم گداز رہنے دے

["کلیاتِ جگر" مجموعہء کلام - جگر مرادآبادی - ص: ۵۵-

حصہ شعلہ طور - ناشر : جگر اکیڈمی - حیدر آباد -

مخزونہ : کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو -]

اس غزلِ مسلسل میں جگر محبوب سے مخاطب ہیں اور اپنے طرح دار انداز میں یوں کہتے ہیں کہ تو مجھے آنکھ ملاتے ہوئے اپنے ناز و ادا سے محروم نہ کر، میں تیری شخصیت میں فنا ہو جانا چاہتا ہوں، تو مجھے پاک باز نہ رہنے دے میں اپنی جان تو قربان کر چکا، تو اپنی چشمِ مست کو ادھ کھلی ہی رہنے دے۔ میں تجھے تیرے ہی شیوہ، عاشقی کی قسم دیتا ہوں کہ تو اپنی مژہ، دراز کو اسی طرح رہنے دے۔ اپنے چہرے کے رخ کو میرے سینے سے نہ ہٹا اور اپنی نگاہوں سے مجھ پر نشتر چلاتی جا۔ اپنی اداؤں کی تلوار کو میرے گلے سے جدا نہ کر اور یہ راز و نیاز کا منظر ابھی رہنے دے۔ یہ تو تیرِ ناز ہے تو شوق سے چلائے جا اور اہلِ نیاز پر جو بھی گزرتی ہے اس کو گزرنے دے۔ میں تیرے خوں ریز غمزوں کا مارا ہوا ہوں اسی طرح اپنی نگاہوں کے اشاروں کو جاری رکھ۔ مجھے تیرے کرم کی ضرورت نہیں میری آتشِ پنہاں ہی مجھے عزیز ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرا دل اسی طرح گداز رہے۔

جگر کی ایک اور غزل ہے۔

❄

یہ نہ پوچھو دہر میں کب سے میں اسی طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں جو نہ اٹھ سکا وہ حجاب ہوں
مجھے غیر سمجھیں نہ اہلِ دل ہمہ تن اگرچہ حجاب ہوں
جو نہاں ہے میری نظر سے بھی میں اسی کے رخ کی نقاب ہوں
نہ تعلقات کی حد کوئی ، نہ توقعات کی حد کوئی
جو کبھی سمجھ میں نہ آسکے ، وہ میں ایک فردِ حساب ہوں
نہ صدائے بلبلِ خوش بیاں نہ سرودِ بزمِ پری رخاں
جو بھرا ہے نغمہ ، درد سے ، وہ میں ایک تارِ رباب ہوں

["کلیاتِ جگر" مجموعہء کلام - جگر مرادآبادی - ص: ۱۹۳ -

حصہ شعلہء طور - ناشر: جگر اکیڈمی - حیدرآباد -

مخزونہ: کتب خانہ ادارہء ادبیاتِ اردو -]

یہاں بھی جگر نے وہی حسن و عشق کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جگر کہتے ہیں: یہ نہ پوچھ کہ اس دنیا میں کب سے میں اسی طرح خانہ خراب اور برباد ہوں۔ میری حیثیت ایک ایسے طلسم کی ہے جو مٹ نہیں سکا اور ایک ایسا پردہ ہوں جو ابھی تک اٹھنے سے قاصر ہے۔ اگرچہ میں پردے میں ہوں پھر بھی اہلِ دل مجھے غیر نہ سمجھیں کیوں کہ میں اس چہرے کی نقاب ہوں جو چہرہ اب تک میری نظر کے سامنے نہیں آیا۔ میری ہستی بھی عجیب ہستی ہے، نہ میرے تعلقات کی کوئی حد ہے اور نہ میری توقعات کی کوئی انتہا۔ میں ایسا انسان ہوں جس کی فطرت کو شاید کوئی سمجھ نہیں سکا۔ جگر کہتے ہیں نہ میں بلبلِ خوش بیاں کی آواز ہوں نہ پری رخوں کی محفل کا نغمہ بلکہ میں تو درد سے بھرا ہوا گیت ہوں اور رباب کا وہ تار جو نغمہ، حزیں کے سوا اور کچھ نہیں دیتا۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نظم نگار نہ ہونے کے باوجود جگر کے پاس کئی ایک غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی اور غزل مزاج ہونے کی دلیلیں ملتی ہیں اس خصوص میں ان کی مسلسل غزلیں پڑھنے کے لائق ہیں جن کے مطلع ہیں:

❄

حسن کافر شباب کا عالم

سر سے پا تک شراب کا عالم

["کلیاتِ جگر" ص: ۱۳-۱۴ - حصہ آتشِ گل -

مخزونہ: کتب خانہ ادارہء ادبیاتِ اردو -]

❄

وہ احساسِ شوقِ جواں اول اول

G M 20 Sad
3

وہ اک عالمِ گل فشاں اول اول

["کلیاتِ جگر" ص: ۱۲ - حصہ آتشِ گل -

مخزونہ: کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو -]

سراپا حقیقت ، مجسم فسانہ !

محبت کا عالم ، جنوں کا زمانہ !

["کلیاتِ جگر" ص: ۳۷ - حصہ آتشِ گل -

مخزونہ: کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو -]

ساغر نظامی کا شمار اردو کے ہمارے نام ور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ساغر نظامی نے نثر اور نظم اور ایک حد تک کہیے کہ مذہبیات کی طرف بھی توجہ کی اور کئی معیاری کتب شائع کیں۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ "شبابیات" ، "داستان" ، "سمندر کی دیوی"۔ افسانوں کا مجموعہ "کہکشاں" غزلیات کا مجموعہ "صبوحی" قومی انقلابی اور رومانی نظموں اور گیتوں پر مشتمل مجموعہ ہائے کلام "بادہ مشرق" ، "رنگ محل" اور "موج و ساحل" شائع ہو چکے ہیں اور اب ڈاکٹر مظفر حنفی نے "کلیات ساغر نظامی" مرتب کیا ہے۔

ساغر نظامی دراصل نظم کے شاعر ہیں اور خاص طور پر قومی موضوعات اور شخصیتوں پر ان کی نظمیں حب الوطنی کے جذبات کو بڑھاوا دینے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ غزلوں میں روایتی انداز ہونے کے باوجود تھوڑا بہت اجتہاد بھی ملتا ہے۔ حسن و عشق کے موضوعات کے باوجود غزلوں میں ہمارے معاشرے کے عام مسائل کی طرف بھی ان کی توجہ رہتی ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی غزلیں دل کش اور دل آویز ہوتی ہیں۔

ساغر نظامی کی غزلیں یوں بھی طویل ہیں، سترہ سترہ، انیس انیس اشعار پر مشتمل۔ لیکن نہ تو مضامین کی تکرار ہوتی ہے اور نہ الفاظ کی۔ اس لیے قاری اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ کلیاتِ ساغر نظامی کا مطالعہ کریں تو چند

ایک مسلسل غزلیں بھی سامنے آتی ہیں۔ یہاں دو ایک کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک غزلِ مسلسل ہے۔

❄

غنچے اداس ، لالہ و ریحاں اداس ہے
وہ روحِ گل نہیں تو گلستاں اداس ہے
چہرے اتر گئے ہیں گلابوں کے باغ میں
مالی جو اٹھ گیا ہے گلستاں اداس ہے
ہر چند روشنی ہے چراغوں میں کچھ مگر
اس کے بغیر بزمِ چراغاں اداس ہے
گر عشق سوگ میں ہے تو ہے حسن ماتمی
چہرہ اداس ، زلفِ پریشاں اداس ہے
زنجیر میں کھنک ہے نہ ہے دار پر شفق
مجنوں نہیں تو عرصہ ، زنداں اداس ہے
وہ شاہدِ تجلیِ لیلیٰ نہیں رہا
مجنوں نہیں تو چشمِ غزالاں اداس ہے
کس میں یہ ظرف ہے کہ پرستاریاں کرے
عاشق نہیں تو بزمِ حسیناں اداس ہے
حسنِ خرامِ ناز کا شاہد نہیں رہا
ہر اک روش پہ سروِ خراماں اداس ہے
داوَدِ وقت کو یہ نظر کس کی لگ گئی
غزلیں اداس اور غزل خواں اداس ہے

عارف کی معرفت سے ہے عرفان پُر جمال
عارف نہیں تو محفل عرفاں اداس ہے

چہروں پہ دوستوں کے نہیں گردِ بے بسی
وہ غم ہے آج روئے حریفاں اداس ہے

وہ حادثہ ہوا ہے کہ ہے وقت اشک بار
فرطِ الم سے گردشِ دوراں اداس ہے۔

وہ جانِ انجمن نہیں اب صدرِ انجمن
شمعیں اداس، بزمِ چراغاں اداس ہے

اب کس کے نقش پا کو عقیدت میں چوم لے
ذاکر نہیں تو منبر و ایواں اداس ہے

دردِ فسردگی سے زمان و مکاں سیاہ
جیسے تمام عالمِ امکاں اداس ہے

ہستی تمام آج اداسی میں غرق ہے
ظاہر ہے غم سے چور تو پنہاں اداس ہے

ساغر اداس، جام اداس اور سبو اداس
ساقی نہیں تو محفلِ رنداں اداس ہے

["کلیاتِ ساغر نظامی" شاعر: ساغر نظامی۔
مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی ص: ۱۵۲ - سنہ اشاعت ۱۹۶۸ء -
ناشر: ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی۔]

اس غزل کی مجموعی فضا اداسی لیے ہوئے ہے۔ محبوب سے دوری نے شاعر کے مزاج میں غم و اندوہ کی

کیفیت پیدا کردی ہے اور اس کو ہر طرف ایک دھندلکا، ایک اداسی اور ایک خاموشی ہی نظر آتی ہے۔ وہ کہتا ہے غنچے اداس اور لالہ و ریحاں اداس، وہ روحِ گل یعنی ہمارا محبوب نہیں تو سارا گلستاں اداس ہے۔ باغ میں گلابوں کے چہرے اتر گئے مالی ہی نہیں تو گلستاں پر اداسی چھا گئی۔ اگرچہ چراغوں میں روشنی ہے لیکن محبوب نہیں تو ساری بزمِ چراغاں بے کیف معلوم ہوتی ہے عشق سوگ میں ہے تو حسن ماتم کر رہا ہے۔ چہرہ ہو کہ زلفِ پریشاں سب پر اداسی چھا گئی ہے، نہ زنجیر میں کھنک ہے نہ دار پر شفق، مجنوں ہی نہیں تو عرصہ، زنداں سے کیا لینا دینا۔ ساغر نظامی آگے چل کر کہتے ہیں وہ شاہد تجلّی لیلیٰ نہیں رہا، چشمِ غزالاں تو ہے لیکن مجنوں نہیں۔ بزمِ حسیناں تو ہے لیکن عاشق نہیں اور حسنِ خرام ناز کا شاہد نہ ہونے کی وجہ سے ہر اک روش پر سرو اداس کھڑا ہے۔ داوَد وقت کو جانے کس کی نظر لگ گئی کہ غزل کا لحن ہی نہیں، غزل خواں بھی اداس ہے۔ عارف کی وجہ سے عرفان کی بھی اہمیت تھی، دوستوں کے چہرے پر گردِ بے بسی نہ ہونے کی وجہ سے حریفوں کے چہرے پر بھی مردنی چھا گئی ہے۔ ایسے حادثے ہوئے ہیں کہ وقت اشک بار ہے اور گردشِ دوراں بھی چپ ہے۔ وہ جو انجمن کی جان تھا وہ نہ ہو تو شمع اور بزمِ چراغاں پر خاموشی کیوں نہ چھا جائے۔ ایک ذاکر کے نہ ہونے کی وجہ سے منبر و محراب ملول ہیں، افسردگی کا زور ہے کہ زماں و مکاں پر غم کی چادر تنی ہوئی ہے۔ یہی نہیں ساری ہستی پر اداسی ہے۔ ظاہر و باطن، سارا عالم امکاں اداسی کی زد میں ہے ساغر، جام، سبو، سب اداس ہیں کہ ساقی نہیں تو محفلِ رنداں کو کون پوچھے۔

ایک اور غزلِ مسلسل ہے۔

❄

ساغر ان کا مسکرانا یاد ہے
مسکرا کر جھینپ جانا یاد ہے
آپ کا دامن اٹھانا یاد ہے
دل کا اٹھ کر بیٹھ جانا یاد ہے

کانپنا اور تھر تھرانا یاد ہے
سر سے پا تک ڈوب جانا یاد ہے
مستقل وہ مسکرانا یاد ہے
روح کو وحشی بنانا یاد ہے
برق بننا اور بنانا یاد ہے
کل اداؤں کا فسانا یاد ہے
بے ترے آنسو بہانا یاد ہے
دل ہی دل میں ڈوب جانا یاد ہے
اس مجسم برقِ حسن و ناز کا
سر سے پا تک مسکرانا یاد ہے
بیٹھے بیٹھے اک ادائے مست سے
ان کا اکثر جھوم جانا یاد ہے
اک ادائے سادہ و پُر کار سے
پاس آکر بیٹھ جانا یاد ہے
عشق کی لے میں باندازِ خیال
حسن کا کچھ گنگنانا یاد ہے
اور پھر رسوائیِ نغمات سے
جھینپ جانا سر جھکانا یاد ہے
محو ہیں "پوجا" میں ہم یہ دیکھ کر
قشقے کو اس کا مٹانا یاد ہے

G

اب کہاں وہ عشرتِ افتادگی
پاؤں پر خود کو گرانا یاد ہے
اب کہاں وہ میکدہ وہ مے کشی
ان کا پینا اور پلانا یاد ہے
اب فراموشی کا وہ عالم کہاں
ماسوا کو بھول جانا یاد ہے
اب کہاں وہ جام اور وہ جم کہاں
پی کے دنیا کو پلانا یاد ہے
کائنات و ماورائے کائنات
ایک پل میں آنا جانا یاد ہے
کیا کہیں کب تک کہیں کیوں کر کہیں
عشق کا سارا فسانا یاد ہے
اے خمارِ زندگی یہ بھی بھلا
کیوں ہمیں اپنا زمانہ یاد ہے

["کلیاتِ ساغر نظامی" شاعر: ساغر نظامی۔
مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی ص: ۱۱۲۔ سنہ اشاعت ۱۳۶۸ء۔
ناشر: ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی ۔]

ساغر نظامی کی یہ غزل انتہائی رومانی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے حسرت موہانی کی وہ غزل یاد آجاتی ہے جس کا مطلع ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

ساغر کی غزل یہی فضا لیے ہوئے ہے۔ ساغر کو اپنے محبوب کا مسکرانا، مسکرا کر جھینپ جانا، دامن اٹھانا، دل کا اٹھ کر بیٹھ جانا، کانپنا اور تھر تھرانا، وہ مستقل مسکرانا، روح کو وحشی بنانا، برق بننا اور بنانا اور اداؤں کا فسانہ یاد ہے۔ یہی نہیں محبوب کی جدائی میں آنسو بہانا اور دل ہی دل میں ڈوب جانا، محبوب کا سر سے پا تک مسکرانا، بیٹھے بیٹھے اک ادائے مست سے جھوم جانا، کبھی عاشق کے پاس آکر بیٹھ جانا، کبھی کچھ گن گنانا اور کبھی رسوائیِ نغمات سے سر جھکانا یاد ہے۔ پوجا میں محو دیکھ کر قشقے کا مٹانا یاد آتا ہے۔ وہ عشرتِ افتادگی اب کہاں لیکن پاؤں پر خود کو گرانا کیسے بھولا جاسکتا ہے۔ نہ اب وہ مے کدہ ہے نہ مےَ کشی لیکن پینا پلانا یاد ہے۔ اب فراموشی کا وہ عالم نہیں لیکن ماسوا کو بھول جانا یاد ہے۔ وہ جام و جم ہی اور تھے، خود پیتے اور دنیا کو پلاتے۔ ہمارا یہ عالم تھا کہ ایک پل میں کائنات و ماورائے کائنات کا سفر کرلیتے، مختصر یہ ہے کہ کہنے میں تکلف تو ہوتا ہے کہ کیسے کہیں، کیا کہیں، کیوں کہیں لیکن عشق کا سارا فسانہ ازبر ہے۔ اور مختصر یہ ہے کہ ہم کو اپنا سارا زمانہ یاد ہے۔

ساغر نظامی کے ہاں کچھ اور غزلیاتِ مسلسل بھی ملتی ہیں مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

❄

مسکائے تھے ہم تنہا ، مر جھائیں گے ہم تنہا
سوکھی ہوئی ٹہنی پر جل جائیں گے ہم تنہا

["کلیاتِ ساغر نظامی" شاعر: ساغر نظامی۔

مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی ص: ۶۵ - سنہ اشاعت ۱۹۶۸ء -

ناشر: ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی -]

○●○

(باب: چھے)

غزلِ مسلسل اور ترقی پسند تحریک

◆◆◆

ترقی پسند تحریک، علی گڑھ تحریک کے بعد اردو دنیا کی اہم ترین تحریک ہے۔ کہنے والے خواہ کچھ کہیں اردو شعر و ادب کو ترقی پسند تحریک کی بڑی دین ہے۔ خاص طور پر نثر میں افسانہ، رپورتاژ، تنقید اور شاعری میں نظم، آزاد نظم اور معریٰ نظم وغیرہ کے باعث ترقی پسند تحریک کے اردو شاعری پر گہرے اثرات ہیں۔ ترقی پسندوں نے ابتدا میں غزل کی بے حد مخالفت کی۔ اس کو ماضی کی یادگار اور بورژوا طبقہ کی علامت قرار دیا اور غزل گوئی کی طرف کم توجہ دی، سوائے مجروح سلطان پوری کے جنھون نے جگر مرادآبادی سے تعلق کے باوجود ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا اور غزلیں بھی زور و شور سے کہیں۔ دیگر شاعروں نے غزل کو ہمیشہ اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ جوشؔ جیسے شاعر جنھوں نے صنفِ غزل پر اچھے خاصے تبرّے پڑھے، شان دار غزلیں کہی ہیں، طرحی مصرعوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور سردار جعفری نے بھی غزل کی مخالفت کو فراموش کر کے غزل گوئی پر توجہ دی۔ ان کی اپنی ایسی غزلوں کی تعداد خاصی ہے جو اردو کی اچھی اور نمائندہ غزلوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے غزل گو شعرا میں ہم سب سے پہلے مجروح سلطان پوری کا نام لیں گے۔

عصرِ حاضر کے شاعروں میں مجروح سلطان پوری وہ نام ہے جس کی ذہنی اور جذباتی وابستگی صرف صنفِ غزل سے ہے۔ مجروح کا علمی و ادبی پس منظر کلاسیکل رہا۔ انھوں نے ہماری شعری بلکہ غزل کی روایات سے بھرپور استفادہ کیا اور صرف اور صرف غزل گوئی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ جگر مراد آبادی کی صحبتوں کے باعث مجروح نے غزل کے سجانے اور سنوارنے میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابتدائی دور میں ترقی پسندوں نے غزل کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ زیادہ تر تو مذمت ہی کی گئی لیکن ہوا یہ کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود مجروح نے غزل سے کنارہ کشی نہیں کی۔ مجروح کی غزل میں کہیں کہیں نعرہ بازی ضرور ملتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر مجروح کی غزل ہماری شعری روایات سے اپنے رشتے کو استوار رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجروح نے غزل میں کسی جدت و ندرت کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ کوئی ایسا ویسا تجربہ لیکن ان کی غزل خاصی آسانی کے ساتھ اردو کے کلاسیکل اور ان کے ہم عصر شاعروں کی غزلوں سے ممیز کی جاسکتی ہے۔ اردو کے بیش تر شاعر ایسے ہیں جن کی غزلوں کے ضخیم ضخیم مجموعے مل جاتے ہیں لیکن مجروح کا معاملہ ایسا ہے کہ ان کا شعری سرمایہ زیادہ نہ ہونے کے باوجود متاثر کرتا ہے۔ مجروح نے صرف غزلیں وہ بھی بہت کم تعداد میں کہی ہیں۔ ظاہر ہے کمیت کے اعتبار سے یہ عدد متاثر نہیں کرتا جب کہ کیفیت کے اعتبار سے مجروح عصرِ حاضر کے غزل گو شاعروں میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزلیں ہی کم کہی ہیں اس لیے ان کے ہاں غزلِ مسلسل کی تلاش بھی کچھ ایسے کامیاب نتیجے سے ہم کنار نہیں کرتی۔ ایک ہی غزلِ مسلسل ہے جو ان کے مجموعہ غزل میں موجود ہے۔

❄

اہلِ طوفاں آؤ ، دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو ، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں
دار پر چڑھ کر لگائیں نعرہ ، زلفِ صنم
اب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

یارِ نکتہ داں کدھر ہے ، پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں
تھامیں اس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں
چوم لیں منہ اور اسے اندازِ رندانہ کہیں
سرخیِ مے کم تھی میں نے چھولئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے ، جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے مے کدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں
پارہ ، دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں
اے رخِ زیبا بتادے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمع ، تنہائی کو پروانہ کہیں
آرزو ہی رہ گئی مجروح کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جانا نہ کہیں

[" غزل " مجروح سلطان پوری- ص: ۶۳-۶۵-۶۶ - چوتھا ایڈیشن-

سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء - ناشر: قلم کار بک سیلرس اینڈ پبلیشر-

فلیو مینالاج - چرچ روڈ جوہو بمبئی-]

مجروح کہتے ہیں کہ اہلِ طوفاں ، جفا کشو آؤ کہ دل والوں کی باتیں کریں اور اہلِ ہمت کی طرح زندگی کی مسابقت میں حصہ لیں ، موج کو گیسو کہیں اور بھنور کو محبوب کی آنکھ سے تشبیہہ دیں ، دنیا خواہ کچھ کہے ، ہمیں دیوانہ ہی قرار دے لیکن سولی پر چڑھ جائیں تو زلفِ محبوب کا نعرہ بلند کریں۔ وہ یار جو نکتہ داں ہے اس سے ملیں،

زندگی کو دل سے تشبیہہ دیں اور دل کو نذرِ محبوب کردیں۔ عالمِ دیوانگی سے سرشار ہوں اور اسی عالم میں محبوب کی کلائی کو تھام لیں اور اپنے جنون کا فائدہ اٹھاتے ہوئے محبوب کا منھ چوم لیں اور اسے اندازِ رندانہ سے تعبیر کریں۔ مجروح کہتے ہیں کہ ہم نے ساقی کے ہونٹ چھولیے کہ سرخیِ مئے کم تھی اب اربابِ مئے خانہ جو چاہے کہیں ہم تو سر جھکائے کھڑے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ صرف پیاس اور تشنگی ہے، مے کدے کا پتہ نہیں، کون جانے پیمانہ کہاں ہے کیوں کہ ہم نے تو پیاسے ہونٹ ہی دیکھے ہیں۔ ہمارے وطن کی سرزمین ہمارے دل کا ٹکڑا ہے، اب چاہے آپ شہر کو ویرانہ کہیں یا دل کو۔ رخِ محبوب سے مخاطب ہیں کہ ہم کب تک اندھیرے کو روشن اور تنہائی کو پروانہ قرار دیں اور پھر یہ آرزو آرزو ہی رہ گئی ایک ایسی غزل کہیں جس میں محبوب کی تصویر جھلک جائے۔

ہر چند کہ کہیں کہیں محسوس نہ ہوتا ہو لیکن مجموعی طور پر یہ ایک ایسی غزلِ مسلسل ہے جو مجروح کے فن کی بھی شان دار مظہر کہی جاسکتی ہے۔

•

مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک کا ایک اہم نام ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فیض اور مخدوم جیسے شاعر جو خود ایک تحریک سے کم نہیں، جنھوں نے اپنی زندگی میں ترقی پسند نظریات کا عملی روپ بھی پیش کیا، غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے ساتھ زندگی بسر کی، اپنے نظریات کی وجہ سے حکومتِ وقت کا عتاب برداشت کیا اور قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کا سرمایۂ سخن ہے بھی بہت کم۔ مخدوم محی الدین کا شعری سرمایہ تو اور بھی کم ہے۔ جو کچھ ہے وہ سب ان کے مجموعے "بساطِ رقص" میں شامل ہے اور "بساطِ رقص" کوئی ایسا ضخیم مجموعۂ کلام نہیں۔ مخدوم ایک عرصے تک نظمیں ہی کہتے رہے اور ان کی شناخت بھی نظم نگار کی حیثیت سے ہی رہی۔ جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے اول تو غزل انھوں نے اپنے شعری سفر میں کہیں آگے چل کر شروع کی اور مجموعی طور پر ان کے غزلوں کی تعداد ۲۶ سے زیادہ نہیں، تاہم غزلوں کی اس مختصر تعداد کے باوجود ان کی غزلیں ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات

سے دل کش اور معنویت کی حامل ہیں۔ مخدوم کے ہاں دو تین غزلِ مسلسل بھی مل جاتی ہیں۔ جس میں انھوں نے غزل کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو ایک خوب صورت نئے پن سے قریب کردیا۔ ان کی بڑی معروف غزلِ مسلسل ہے۔

❄

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی، رات پھولوں کی
آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی
نظریں ملتی ہیں، جام ملتے ہیں
مل رہی ہے حیات پھولوں کی
کون دیتا ہے جان پھولوں پر
کون کرتا ہے بات پھولوں کی
وہ شرافت تو دل کے ساتھ گئی
لُٹ گئی کائنات پھولوں کی
اب کسے ہے دماغِ تہمتِ عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی
میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی
یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

["بساطِ رقص" مخدوم محی الدین۔ ص ۱۳۶۔ تیسرا ایڈیشن۔
سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء ۔ ناشر: اردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔ حیدرآباد۔]

اس غزل میں پھولوں کی رعایت سے مخدوم نے کئی کئی پہلو تراشے اور بات میں بات پیدا کی ہے۔ زبان اور اندازِ بیان انتہائی سہل و سادہ کہ غزل ادھر پڑھی اور ادھر اس نے قاری کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ اس غزل میں مخدوم کہتے ہیں: رات کا وقت ہے پھولوں کی بات چھڑ گئی ہے، پھول بھی اتنے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ رات نہیں پھولوں کی بارات ہے۔ جدھر دیکھیے پھول کے ہار ہیں، پھول کے گجرے ہیں، شام بھی پھولوں سے بھری ہے اور رات بھی پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ ایسے میں محبوب کا ساتھ نہیں پھول کا ساتھ معلوم ہوتا ہے اور محبوب کی بات بھی پھولوں کی بات لگتی ہے۔ محبوب سے نظریں ملتی ہیں، شراب کے دور چلتے ہیں گویا پھولوں کو یہ زندگی مل رہی ہے ایسے میں کون ہے جو پھول پر جان دیتا ہے اور کون ہے جو پھولوں کی بات کرتا ہے۔ تہذیبی قدریں بھی اپنا رنگ بدل رہی ہیں، شریفانہ اندازِ دل کے ساتھ گویا پھولوں کی کائنات لٹ گئی۔ ایسے میں کون ہوگا جو تہمتِ عشق کی سوچے اور جو پھولوں کی بات سنے لیکن میرے دل میں صبحِ بہار کے کیف و سرور کا عالم ہے اور محبوب کی آنکھوں میں پھولوں کی راتیں مہک رہی ہیں، جب پھول ہیں تو دنیا میں کھلتے رہیں گے اور روز پھولوں کی بات نکلے گی۔ آخر میں مخدوم کہتے ہیں کہ ان کی یہ پھولوں سے مہکتی ہوئی غزل ایسی ہے جیسے صحرا میں پھولوں کی رات اتر آئی ہو۔

مخدوم کی ایک اور غزل بھی غزلِ مسلسل ہی کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ غزل ہے:

❄

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

["بساطِ رقص" مخدوم محی الدین۔ ص ۱۳۸۔ تیسرا ایڈیشن۔
سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء ۔ ناشر، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش ۔حیدرآباد۔]

اس غزلِ مسلسل میں بھی وہی رومانی کیفیت ہے جس کی وجہ سے سادگی اور سلاست کے باوصف اشعار متوجہ کرلیتے ہیں وہ کہتے ہیں جب محبوب کی یاد رات بھر آتی رہی ہماری آنکھیں نم ہوگئیں لیکن خوبی یہ ہے کہ محبوب کی یاد کی وجہ سے آنسوؤں کے باوجود آنکھوں میں مسکراہٹ بھی رہی۔ ظاہر ہے اس غزل میں ہجر کا بیان کیا گیا ہے اور اس کی رعایت سے تشبیہات اور استعارات اور پیکر تراشی بھی۔ شاعر کہتا ہے رات بھر درد کی شمع جلتی رہی اور غم کی وجہ سے ہم بھی تڑپتے رہے۔ رات بھر یہ عالم تھا کہ بانسری کی سریلی آواز بھی یادِ محبوب بن کے آتی رہی۔ یادوں کا غلبہ وہ تھا کہ جگمگاتی چاندنی میں محسوس ہو رہا تھا کہ دل میں یاد کے چاند اتر رہے ہیں۔ ایسے میں نہ جانے کون دیوانہ تھا جو گلیوں میں پھرتا رہا اور اسی کی آواز رات بھر آتی رہی۔

•

سردار جعفری ان ترقی پسند شاعروں میں ہیں جن کی وجہ سے ترقی پسند تحریک ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ سردار جعفری مجروح سلطان پوری سے قطعِ نظر ان ترقی پسند شاعروں میں ہیں جنھوں نے نظم نگاری پر ہی توجہ دی اور جن کے ہاں غزلیں کچھ ایسی زیادہ نہیں ملتیں۔ ترقی پسندوں نے کبھی غزل کی مخالفت کی ہو۔ لیکن ترقی پسندوں نے کم ہی سہی غزلیں ضرور کہی ہیں۔ کمیت میں یہ غزلیں زیادہ نہ ہوں، کیفیت میں ان کو اعلیٰ درجہ مل ہی جاتا ہے۔ چناں چہ فیض، مخدوم، مجاز، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی غزلیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور اردو غزل کا اہم اثاثہ بھی ہیں۔ سردار جعفری کے ہاں بھی یہی کیفیت ہے ان کے ہاں غزلیں نظموں سے کہیں کم ہیں لیکن اپنی آن بان اور شان و شوکت اور طمطراق کی حامل ہیں۔

سردار جعفری کے ہاں کم ہی سہی غزلِ مسلسل بھی ملتی ہے، جس میں انھوں نے اپنے انداز میں بات کہی ہے۔ ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

❄

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں ، وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ
پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ
حوصلہ ہو تو اُڑو میرے تصوّر کی طرح
میری تخئیل کے گل زارِ جناں تک آؤ
تیغ کی طرح چلو چھوڑ کے آغوشِ نیام
تیر کی طرح سے آغوشِ کماں تک آؤ
پھول کے گرد پھرو باغ میں مانندِ نسیم
مثلِ پروانہ کسی شمعِ تپاں تک آؤ

لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں

اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہنچو

پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اسی دنیا میں دکھادیں تمھیں جنت کی بہار

شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

| ”ایک اور خواب“ سردار جعفری۔ ص: ۷۳-۷۵۔

تیسرا ایڈیشن۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ۔ |

سردار جعفری اس غزل میں محبوب سے مخاطب ہیں یا نوجوان نسل سے یا کسی اور سے لیکن مخاطب کو عزم و حوصلے کی ترغیب دیتے ہوئے وہ اپنے نظریات کی طرف انھیں متوجہ کرتے ہیں۔ زمانے کے اونچ نیچ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مخاطب کو ایک نئے معاشرے اور نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ اس نئی دنیا میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں میں تم کو جہاں تک بلاتا ہوں وہاں تک آؤ، میرے دل و جاں تک۔ میرا مقصودِ نظر جو جنت ہے میں تمھیں وہاں تک آنے کی دعوت دیتا ہوں تاکہ تمھیں زمانے کی ہوا کا بھی اندازہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میں اتنا حوصلہ ہو کہ تم میرے تصور کی طرح پرواز کرو اور میرے تخیل کی جنت تک آنا تم کو مبارک ہو۔ اور آؤ بھی کیسے، تلوار کی طرح آغوشِ نیام سے نکلو اور تیر کی طرح آغوشِ کماں تک آؤ۔ زندگی گزارنا ہو تو باغ میں نسیم کی طرح پھولوں کے گرد پھرو اور پروانے کی طرح روشن شمع تک آؤ۔ سردار جعفری کہتے ہیں وہ ظلم و استبداد کا دور، وہ جہنم سے ماہ و سال ختم ہوئے، اب ایک نیا دور آچکا ہے۔ نئے ماہ و سال میں جنت ہی جنت ہے تم جہاں تک آؤ۔ یہ صحیح ہے وہم و گماں سے گزر کر حق و یقین تک پہنچنا چاہیے لیکن کبھی کبھی یقین سے پرے ہوتے ہوئے وہم و گماں تک بھی آنے کی کوشش کرو۔ سردار جعفری آخری شعر میں شیخ پر طنز کرتے ہیں کہ شیخ جی تم جو ہمیشہ جنت کی باتیں کرتے ہو، ذرا محبوب کے کوچے تک آجاؤ تو تمھیں جنت

کی بہار دکھادیں ،کوچہ ءِ محبوب جنت سے کم نہیں۔

•

اردو کی جدید شاعری میں جن شاعروں نے اپنی حیثیت نمایاں کی ہے ان میں شہریار بھی شامل ہیں۔ شہریار شعری دنیا میں آہستہ آہستہ اور دبے پاؤں آئے اور جلد ہی انھوں نے اپنا لوہا منوالیا۔ ترقی پسندی سے تھوڑے بہت لگاؤ کے باوجود شہریار ترقی پسندوں سے دور بھی رہے۔ اسی طرح جدیدیت سے قربت کے باوجود انھوں نے جدیدیت کے بیش تر اوصاف کو اپنی شاعری سے مبرا رکھا۔ شہریار پر کسی تحریک یا رجحان کا لیبل لگایا جائے، سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی تحریک یا رجحان سے قطع نظر آپ اپنی پہچان اور شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کئی زاویوں سے امتیازی اور منفرد ہے۔ جیسا کہ وحید اختر نے لکھا ہے:

"شہریار کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ معمے ہیں، نہ پہیلیاں، چٹکلے ہیں نہ لطیفے بلکہ ایسے لختِ ہائے جگر ہیں جن میں ہمارے عہد کا ادبی مزاج بھی ملتا ہے اور آج کے انسان کے دل کا خون بھی۔ شہریار کی آواز میں جو نغمگی کی کیفیت، دردمندی اور ہلکا سا تفکر ملتا ہے وہ انھیں ایک خاص انفرادیت عطا کر رہا ہے۔"

[وحید اختر "تعارف" اسمِ اعظم۔ مشمولہ،

"حاصلِ سیرِ جہاں" سنِ اشاعت ۲۰۰۱ء]

یہی انفرادیت شہریار کی ادبی شخصیت کی ضامن ہے۔ شہریار کی شاعری کی اہم خوبی اس کا ہلکا پھلکا انداز، سیدھے سچے جذبات، سادہ اور رواں دواں زبان اور صاف اور سہل لہجہ ہے۔ شہریار نے ابہام اور اشاریت سے ضرور کام لیا ہے مگر اپنے اشعار کو معمّوں سے بچاتے ہوئے۔

"اسمِ اعظم" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے اور پھر "ساتواں در"، "ہجر کے موسم"، "خواب کا در بند ہے" اور "نیند کی کرچیں" جو کلیات کی شکل میں "حاصلِ سیرِ جہاں" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔ شہریار نے بہ تدریج اپنا جو شعری سفر جاری رکھا اس کی آئینہ داری ان شعری مجموعوں سے ہو جاتی ہے۔ شہریار نے نظمیں

بھی کہیں بلکہ نثری نظمیں بھی لیکن ان کی غزلوں میں جو نزاکت اور معنی آفرینی ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ در اصل غزل کے شاعر ہیں اور اس دور میں جن شاعروں نے اردو غزل کی آبرو برقرار رکھی ہے ان میں ایک شہریار بھی ہیں۔ شہریار غزل مزاج ہونے کے باوجود ان کے ہاں غزلِ مسلسل کم ہی ملتی ہیں۔ چناں چہ یہاں ان کی ایک غزلِ مسلسل کا تجزیہ پیش ہے:

❄

شبِ غم کیا کریں کیسے گزاریں
کسے آواز دیں ، کس کو پکاریں
سرِ بام تمنّا کچھ نہیں ہے
کسے آنکھوں سے اس دل میں اتاریں
وہی مبہم سی سرگوشی ہوا کی
وہی افسردہ شمعوں کی قطاریں
وہی دھندلے سے ننھے ننھے سائے
وہی سونی سسکتی رہ گزاریں
کہاں تک یادِ غم خواری کرے گی
کہاں تک زلفِ تنہائی سنواریں
مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے
خلا میں اک نیا چہرہ ابھاریں
اٹھو نیندوں سے آنکھوں کو جلائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

| "اسمِ اعظم" کلیات۔ شاعر، شہریار۔

شہریار کہتے ہیں شبِ غم ہے جس کا گزرنا کارِ دشوار ہے، سمجھ میں نہیں آتا کسے آواز دیں، کس کو پکاریں، اب کوئی تمنّا بھی نہیں اس دل میں کہ کسی کو جگہ دیں، ہر طرف اداسی کا ماحول ہے۔ ہوائیں جیسے سرگوشیاں کر رہی ہوں۔ شمع ہے لیکن شبِ غم کے باعث افسردہ رہتی ہے۔ ہر طرف ایک دھند، ایک کہر ہے گویا داغ داغ اجالا کی سی کیفیت، راستے سونے سونے لگتے ہیں گویا سسک رہے ہیں، یادیں کب تک ساتھ دیں گی، کتنا غم بٹائیں گی، تنہائی تو مقدر بن چکی ہے، کسی طرح گزر کرنی ہے، اب اور کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ تصور میں خلاؤں میں اپنے طور پر کوئی چہرہ ابھارلیں، نیندیں آنکھوں کو جلا رہی ہیں، خواب بھی چھن گئے ہیں۔ خوابوں کی پریوں کو پکارنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ کچھ تو نیند آئے، خواب دیکھنے کی سبیل نکلے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ شہریار کی شاعری خواہ اس میں ترقی پسند رجحانات تلاش کیے جائیں یا جدیدیت کی مہک محسوس ہو، وہ شہریار کے دل ہی کی نہیں ان کے دور کی بھی آواز ہے۔

•

پروفیسر مغنی تبسم نے شاعری پر توجہ ابتدا ہی سے دی لیکن کم۔ مغنی تبسم کا ادبی سرمایہ زیادہ تر نثر اور خاص طور پر تنقید و تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ فانی بدایونی پر ان کا کام اردو تحقیق میں اپنی مثال آپ ہے۔ "آواز اور آدمی" اور "لفظوں سے آگے" ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں جن کو ادبی حلقوں میں خاصا اعتبار حاصل ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مغنی تبسم کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔۔۔ "پہلی کرن کا بوجھ" اور "مٹی مٹی میرا دل"۔ مٹی مٹی میرا دل مزید اضافوں کے ساتھ اور پھر "درد کے خیمے کے آس پاس"۔ مغنی تبسم کم کہتے ہوں لیکن ان کے پاس شعری رچاؤ اور ادبی نکھار بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی اور غزلیں بھی لیکن جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ان کی غزلیں بے حد مختصر ہوتی ہیں۔ بعض غزلیں تو اتنی مختصر کہ بس تین چار اشعار پر مشتمل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مغنی تبسم نے سخت انتخاب کے بعد انھیں اپنے مجموعے میں شامل کیا ہو۔ جدید اور نئی غزل کی باتیں ہم کرتے ہیں اور ان میں تھوڑا بہت امتیاز بھی موجود ہے۔

مغنی تبسم نے کبھی جدیدیت کو اختیار کیا اور اس کے سرگرم حمایتیوں میں رہے۔ اور اب وہ ترقی پسندی کی طرف مائل ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں پر نہ پہلے اور نہ اب کسی خاص تحریک یا رجحان کا اثر ملتا ہے۔ وہ اپنے انداز اور اپنے قرینے سے شعر کہتے۔ مغنی تبسم کو زبان و بیان ہی پر نہیں بلکہ فن عروض پر بھی بے اندازہ دست رس حاصل ہے۔ وہ شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ زندگی اور زمانے پر ان کی گہری نظر ہے ہی، وہ غمِ ذات کو بھی نہایت ہنرمندی کے ساتھ اور شستہ انداز میں پیش کردیتے ہیں۔ مغنی تبسم نے زیادہ تر مختصر بحروں سے کام لیا ہے۔ اور سادگی بیان نے ان کے ہاں طرفگی پیدا کردی ہے۔ جذبات کی سادگی اور غم انگیز فضا کے باعث ان کی یہ غزلیں متاثر بھی کرتی ہیں۔ سیدھا سادا اندازِ زبان و بیان، کسی الجھاؤ سے مبرا، تشبیہات و استعارات کم، اور ہوں بھی تو فہم کی زد میں ہیں۔ اعلانیہ لگتا ہے کہ شاعر نے ژولیدہ بیانی سے پرہیز کیا ہے الفاظ کی نشست و برخاست اور مصرعوں کے در و بست میں بھی مغنی تبسم اپنی فن کاری کے نشانات ثبت کرتے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں جو دھیمی حزنیہ کیفیت ملتی ہے وہ فانی کا اثر نہیں بلکہ ان کی زندگی کا پرتو ہے۔ کم سے کم اشعار پر مشتمل غزلیں کہنے کے باوجود مغنی تبسم کے ہاں مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں ایک غزل پیش ہے۔

❄

منزلیں اس کی مرادوں کا نگر اس کا ہے
پاؤں میرے ہیں تقاضائے سفر اس کا ہے
لوح اس کی ہے، قلم اس کا، مقدر میرا
ہاتھ میرے ہیں دعاؤں میں اثر اس کا ہے
اس کی راتیں مرے خوابوں کو جنم دیتی ہیں
جاگتی آنکھوں سے پیمانِ سحر اس کا ہے
دل، کہ رستہ ہے شکستہ و زبوں یادوں کا
مہرباں ہو کے وہ آجائے تو گھر اس کا ہے

۱ " درد کے خیمے کے آس پاس " شاعر، مغنی تبسم - ص،۱۳۰ -

سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء - ناشر، مکتبہء شعر و حکمت - حیدرآباد - ۱

اس غزل کا آہنگ ہی کچھ اور ہے۔ عام روایتی انداز، لفظیات، اسلوب اور لہجے کے قطع نظر مغنی تبسم نے کچھ ایسے جدید اور نئے رنگ سے کام لیا ہے کہ ان کے بہت کم ہم عصروں کے پاس یہ اسلوب اور لہجہ ملتا ہے۔ اس غزل کو جو حمدیہ انداز میں لکھی گئی ہے پڑھتے ہوئے قاری ایک عجیب کیفیت محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منزلیں ہوں کہ مقام سب ذاتِ الٰہی سے ہیں۔ پاؤں ہمارے سہی لیکن تقاضائے سفر اسی کا ہے۔ مقدر میرا ہے لیکن لوح و قلم ذاتِ الٰہی کے۔ دعاؤں کے لیے ہاتھ میں اُٹھاتا ہوں لیکن دعاؤں میں اثر اسی کا ہے۔ راتیں تو قدرت کی ودیعت کی ہوئی ہیں لیکن خواب میرے ہیں اور اسی طرح جاگتی آنکھوں سے اس کا پیمانِ سحر ہے۔ میرے دل کا عالم یہ ہے کہ گویا شکستہ و زبوں یادوں کا رستہ ہو۔ ہاں وہ ادھر آجائے تو یہ اسی کا گھر ہو گا، اس کی منزل ہوگی۔

مغنی تبسم کی ایک اور غزل مسلسل ہے۔

❋

سفر دیا ہے تو منزل کا بھی پتہ دے گا
مرا خدا مجھے رستہ کوئی دکھا دے گا
قدم قدم پہ دکھائے گا آیتیں اپنی
ہر ایک موڑ پہ منظر مجھے نیا دے گا
لپیٹ دے گا مجھے ظلمتوں کی چادر میں
پھر اک چراغ مری راہ میں جلا دے گا
بڑھا کے دل میں کسی انتظار کی لذت
نظر کے واسطے تاروں کا سلسلہ دے گا

رکھے گا مجھ کو سدا جبر کی پناہوں میں
جو خواب دیکھنے لگ جاؤں تو جگا دے گا
زمیں کی پیاس بڑھائے گا آگ برسا کر
لہو کو حرفِ صداقت کا واسطہ دے گا
کرم کیا کہ عطا کی گناہ کی توفیق !
کرم کرے گا گناہوں کا جب صلہ دے گا

["درد کے خیمے کے آس پاس" شاعر : مغنی تبسم - ص: ۲۰ -

سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء - ناشر : مکتبۂ شعر و حکمت - حیدر آباد -]

اس خوب صورت غزل میں مغنی تبسم نے فطرتِ انسانی کے بعض گوشوں کی خوبی سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں دینے والے نے جب سفر کا حوصلہ دیا ہے تو منزل کا پتہ بھی دے گا۔ جب وہ میرا خدا ہے تو یقیناً میری رہنمائی کرے گا۔ قدم قدم پر وہ اپنی آیتوں سے آشنا کرے گا اور ہر موڑ پر ایک نئے منظر کا سامنا ہو گا۔ پہلے تو وہ مجھے ظلمتوں کی چادر میں لپیٹ دے گا لیکن پھر میری رہنمائی کے لیے چراغ بھی جلا دے گا کہ میں اس کی روشنی میں آگے بڑھوں۔ مجھے انتظار کی لذت سے آشنا کرے گا اور اس انتظار میں میرے لیے تارے گننے کا سامان بھی فراہم ہو گا۔ میری آزادی گویا سلب ہو جائے گی۔ میں اس کے جبر کی پناہوں میں محصور رہوں گا کہ اگر خواب بھی دیکھنا چاہوں تو دیکھ نہ پاؤں کہ وہ مجھے جگا دے گا۔ آگ ایسی برسے گی کہ زمین کی پیاس بڑھ جائے گی اور لہو کو صرف حرفِ صداقت سے واسطہ ہو گا۔ آخری شعر میں مغنی تبسم کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے مجھے گناہوں کی توفیق عطا کی لیکن مجھے ان گناہوں کا صلہ بھی دے کہ یہی تیرا کرم ہو گا۔

مغنی تبسم کے ہاں اور مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں خاص طور پر ان کی غزلوں کے مجموعہ "درد کے خیمے کے آس پاس" میں ملاحظہ کیجیے۔

❄

چاند ہی نکلے کہ بادل سے کہیں تو نکلے
برق چمکی تو عجب آس کے پہلو نکلے

["درد کے خیمے کے آس پاس" شاعر: مغنی تبسم۔
ص: ۷۰۔ سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء۔ ناشر: مکتبہء شعر و حکمت۔ حیدرآباد۔]

❄

یوں لگتا ہے سب کچھ کھونے آیا تھا
میں اس گھر میں تجھ کو رونے آیا تھا

["درد کے خیمے کے آس پاس" شاعر: مغنی تبسم۔
ص: ۷۳۔ سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء۔ ناشر: مکتبہء شعر و حکمت۔ حیدرآباد۔]

❄

تارے ڈوبیں تو اچھا ہے، چاند بجھے تو بہتر ہے
کوئی نہیں آئے گا یہاں، اب آنکھ لگے تو بہتر ہے

["درد کے خیمے کے آس پاس" شاعر: مغنی تبسم۔
ص: ۷۵۔ سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء۔ ناشر: مکتبہء شعر و حکمت۔ حیدرآباد۔]

❄

صبحیں کیسی آگ لگانے والی تھیں
شامیں کیسی دھواں اٹھانے والی تھیں

["درد کے خیمے کے آس پاس" شاعر: مغنی تبسم۔
ص: ۶۲۔ سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء۔ ناشر: مکتبہء شعر و حکمت۔ حیدرآباد۔]

(باب: سات)

غزلِ مسلسل عصرِ حاضر میں

◆◆◆

GM

ترقی پسند تحریک سے قطع نظر ہماری دنیا میں اور بھی شاعر رہے جنھوں نے کسی نظریہ / تحریک سے وابستگی ناوابستگی کے بغیر اپنا شعری سفر جاری رکھا۔

سکندر علی وجد کا شمار بھی ان ہی شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے کسی ادبی یا سیاسی نظریے، تحریک اور ازم سے بے تعلق رہ کر اپنی زندگی اور ادبی شخصیت تشکیل دی۔ وجد رومانی شاعر ہیں۔ لطیف اور ہلکے پھلکے جذبات، زندگی کے عام اور چلتے چلاتے موضوعات، صاف سیدھی اور سہل زبان، تھوڑی بہت غنائیت اور دل نشین لہجے نے وجد کو اپنے عہد کا مقبول شاعر بنا دیا۔ وجد کی نظمیں اجنتا، ایلورہ، جامعہ، عثمانیہ وغیرہ اپنے موضوع اور اسلوب کے باعث اردو کی یادگار نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ وجد نے غزلیں بھی بڑی ہلکی پھلکی کہی ہیں۔ تغزل کی دھیمی چاشنی نے ان غزلوں کو نکھار دیا ہے۔ وجد کے پاس غزلِ مسلسل ہے لیکن زیادہ نہیں۔ یہاں ایک غزلِ مسلسل درج کی جاتی ہے۔

❄

کیا بتاؤں تجھے میں کیا ہے تو

میرے جینے کا آسرا ہے تو
میں کہاں منّتِ طبیب کہاں
میرے ہر درد کی دوا ہے تو
میں تو سایہ نہیں ہوں کچھ تیرا
اپنے سائے سے کیوں خفا ہے تو
رازِ الفت نہ فاش ہو جائے
مجھ کو شرما کے دیکھتا ہے تو
ہر مصیبت میں دیکھ اپنی طرف
مظہرِ ذاتِ کبریا ہے تو
وجد طوفاں کا پھیر دے دھارا
حیف تنکوں میں بہہ رہا ہے تو

ا " وجد " انتخابِ کلام سکندر علی وجد - ص: ۳۵-۳۶ -
سنہ اشاعت ۱۹۵۷ء - ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ -
مخزونہ: کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد - ا

اس غزلِ مسلسل میں وجد نے محبوب سے اپنی وابستگی کو نہایت خوب صورت پیرائے میں منکشف کیا ہے۔ وہ محبوب ہی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنی حقیقت تجھ سے کیا بیان کروں کہ میری زیست کا سہارا تو ہے، میں کیوں کسی طبیب کے علاج کا احسان اٹھاؤں کہ تو ہی میرے ہر درد کی دوا ہے۔ میں تیرا سایا تو نہیں ہوں لیکن تو اپنے سائے سے کیوں خفا ہے۔ تو میری طرف شرما کے جو دیکھتا ہے کہیں لوگ اسے دیکھ نہ لیں اور یہ نتیجہ نہ اخذ کریں کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ یوں ہمارا راز فاش نہ ہوجائے۔ ہر مصیبت میں تو اپنی طرف دیکھ تو ہی مظہرِ ذاتِ کبریا ہے۔ آخری شعر میں وجد اپنے آپ سے

مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم چاہیں تو طوفان کے رخ کو پھیر دیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم تنکوں میں بہہ رہے ہیں۔ وجد کے کلیات "جمالِ اجنتہ جلالِ ہمالہ" میں اور بھی چند غزلیاتِ مسلسل مل جاتی ہیں۔

•

صاحب زادہ میکش حیدر آبادی کو زیادہ شہرت نہ ملی ہو لیکن ان کی شعری مرتبت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میکش ہلکی پھلکی اور رومانی شاعری کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ میکش کی شاعری کا دور وہ دور تھا جب کہ اختر شیرانی اپنی رومانی رنگ والی شاعری کی وجہ سے ایک خاص طبقے میں غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ کوئی عجب نہیں میکش بھی ان سے متاثر ہوئے ہوں کہ جہاں تہاں ان کے اشعار اس کی غمازی کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے میکش کی شاعری مروجہ اور عام رومانیت سے خاصی جدا نظر آتی ہے۔ انھوں نے ہلکے پھلکے خیالات ہلکے پھلکے انداز میں نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کردیے ہیں۔ "دو آتشہ" میکش کا وہ مجموعہ کلام ہے جو ان کے انتقال کے بہت بعد اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش نے شائع کیا۔ اس کی پہلی ہی غزل غزلِ مسلسل ہے جو میکش کے رنگِ شاعری کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے، غزل درج ذیل ہے۔

❄

شرابِ ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا
پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
کہیں نگاہ کی مستی بھی حل نہ ہو جائے
کہ جامِ مے کی طرف سے نظر ہٹا کے پلا
جھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرِ مے میں
پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
پلا ہر اک کو ہر اک پر نوازش کر
مگر یہ شرط ہے پہلے مجھے پلا کے پلا

شراب نغمہ بھی بنتی رہے فضاؤں میں
کلامِ حافظ و خیام گنگنا کے پلا

ترا خیال ہے مجھ کو ، کبھی نہ بہکوں گا
تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا

جھجک رہا ہوں کہ زاہد نہ دیکھ لے مجھ کو
پیوں گا چھُپ کے میں ، ساقی مجھے چھُپا کے پلا

یہ چاندنی کی بہاریں نہ آئیں گی ہر شب
شعاعِ ماہ میں کیفِ نظر مِلا کے پلا

یہ روزِ ابر ، یہ ہلکی پھوار ، یہ مستی
ادھر تو دیکھ ، نگاہیں ذرا اٹھا کے پلا

کچھ امتیاز رہے مے کدے میں میکش کا
لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

| " دو آتشہ " شعری مجموعہ - میکش حیدرآبادی - ص، ۲۳-۳۲-
مرتبہ، عزیز قیسی - ناشر، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش - حیدرآباد-
مخزونہ، کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو - |

میکش اپنے ساقی سے کہیے یا محبوب سے کہتے ہیں کہ وہ خالص شراب جو پلا رہا ہے اس کو دو آتشہ بنا کے پلا اور یہ دو آتشہ اسی وقت بنے گی جب محبوب اپنی مخمور نگاہوں سے نگاہیں ملا کر پلائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہیں نگاہوں کی مستی بھی شراب میں حل نہ ہوجائے ،اسی لیے جامِ شراب دیتے ہوئے اس سے نظر ہٹا کے پلا۔ محبوب کی مسکراہٹ ایسا لگتا ہے شراب کے پیالے میں چھلک رہی ہے ، شاعر چاہتا ہے محبوب اسی طرح مسکرا کر شراب پلاتا رہے۔ شاعر کو اعتراض نہیں ہے کہ ساقی دوسروں کو بھی شراب پیش کررہا ہے جب کہ

شرط صرف یہی ہے کہ وہ پہلے شاعر کو پلائے اور بس۔ ساقی شراب تو پلا ہی رہا ہے اور اگر حافظ و خیام جیسے شاعروں کا کلام گنگناتے ہوئے پلائے تو فضاؤں میں بھی نغمہء شراب رچا بسا دکھائی دے گا۔ میکش کہتے ہیں کہ میں کتنا بھی پیوں بہکنے والا نہیں، ساقی سو بار آزما کے پلائے یہی کیفیت رہے گی۔ جھجک یہ ہے کہ کہیں زاہد شراب پیتے ہوئے نہ دیکھ لے اس لیے بہتر ہو گا کہ مجھے چھُپ چھُپا کر شراب کا پیالہ دے یہ چاندنی راتیں بھلا پھر کب میسر ہوں گی، اگر چاند کی شعاعوں میں محبوب کی کیفِ مستی مل جائے تو لطفِ شراب دو بالا ہو جائے گا۔ موسم بھی ایسا خوش گوار ہے، ہلکی ہلکی پھوار ہے، مستی کا سماں ہے۔ شاعر بس یہ چاہتا ہے کہ ساقی ذرا نظریں اٹھا کے پلائے تو مزا آجائے۔ میکش کا کہنا یہی ہے کہ وہ دیگر پینے والوں سے خود کو ممیز کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساقی اپنے لبوں سے جام لگا کر میکش کو پیش کرے تاکہ شاعر کی امتیازی حیثیت برقرار رہے۔

میکش کے ہاں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں۔ ایک اور غزل کا مطلع ہے ؂

گرتے گرتے ان کا دامن تھام لے
گرنے والے لغزشوں سے کام لے

●

بیسویں صدی کے نصف دوم میں جن شاعروں نے غزل کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس کی آبرو میں اضافہ بھی کیا ان شاعروں میں ناصر کاظمی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انیسویں صدی، ۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں جو نقلِ مقامی ہوئی ناصر کاظمی بھی ہندستان سے پاکستان منتقل ہوئے۔ تقسیم ہند اور فسادات کے نتیجے میں برصغیر میں جو انسانی خون کی ہولی کھیلی گئی، انتشار و اختلال ہوا، قدریں پامال ہوئیں، انسان کا انسان دشمن ہوا، نفسا نفسی کا عالم رہا، درندگی اور حیوانیت نے ننگا رقص کیا اور بہیمیت جو عام ہوئی، یہ بہت کچھ ناصر کاظمی کی نظروں سے گزرا اور پھر ان کے ذاتی حالات، غمِ عشق اور غمِ روزگار نے ان کی شاعری کو کچھ ایسا موڑ دیا کہ اس میں ان مذکورہ سانحات کی دردناک اور عبرت انگیز تصویریں ملتی ہیں۔ ناصر کاظمی کی شاعری پر چاہے آپ میر کا اثر کہہ لیجیے یا فراق کا، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ان کے اپنے تاثرات، مشاہدات اور احساسات کی

GM

ترجمان ہے۔ زیادہ تر چھوٹی بحریں، سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ اور کسی داؤ پیچ کے بغیر جذبات کا اظہار ناصر کاظمی کی غزلوں کو اپنی مثال آپ بنادیتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے دور کی تصویر، تعبیر اور تفسیر بن جاتی ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں جو درد انگیزی ہے وہ اور شاعروں کے پاس کم کم ہی ملے گی۔ ان کی غزل قاری کو بہ ایں اسباب کئی طرح متاثر کرتی ہے۔ بعض وقت خیالات کا تسلسل کچھ یوں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے مربوط اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں گویا غزلِ مسلسل کی مثالیں ناصر کاظمی کے ہاں سے کئی ایک دی جاسکتی ہیں۔ یہاں جو دو غزلیں منتخب کی گئی ہیں ان میں سے ایک ہے:

❄

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے

دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے

پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتلِ گل عام ہوا ہے اب کے

شفقی ہوگئی دیوارِ خیال!
کس قدر خون بہا ہے اب کے

منظرِ زخمِ وفا کس کو دکھائیں
شہر میں قحطِ وفا ہے اب کے

وہ تو پھر غیر تھے لیکن یارو
کام اپنوں سے پڑا ہے اب کے

کیا سنیں شورِ بہاراں ناصر

ہم نے کچھ اور سنا ہے اب کے

| "دیوانِ ناصر کاظمی" - ص، ۳۸-

سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء - ناشر، حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - حیدرآباد-

مخزونہ، کتب خانہ ادارہء ادبیاتِ اردو - حیدرآباد- |

اس غزل میں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے تقسیمِ ہند کے رد عمل کے طور پر جو بھی ہوا ناصر کاظمی نے اپنا دیکھا دکھایا منظوم کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ کیسی ہوا چلی ہے اس بار پھول ہی خوشبو سے جدا ہوگیا ہے ہر چند کہ دوست بچھڑتے ہیں اور بچھڑتے رہتے ہیں لیکن اس بار تو ایک نیا ہی داغ کھلا ہے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ناگفتہ ہے کہ پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں، جو اس بات کا اظہار ہے کہ قتلِ گل زار ہوا ہے۔ خون اس طرح بہا ہے کہ دیوارِ خیال شفق رنگ ہوگئی ہے جو لوگ زخمِ وفا کھاچکے ہیں وہ اپنے زخم کس کو دکھائیں کہ شہر میں وفا کا قحط پڑچکا ہے۔ غیروں کو چھوڑیے ان کا رویّہ جیسا بھی ہو لیکن اب تو کام اپنوں سے پڑا ہے۔ مقطع میں نہایت ایمائی انداز میں شاعر کہتا ہے کہ بہاروں کا شور کیا سنیں، ہم نے تو کچھ اور سنا ہے۔ بہار نہیں خزاں چمن کا مقدر ہوچکی ہے۔

ناصر کاظمی کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❋

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی
ان جلتی ابلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے

اب شہر میں اس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں
ایوانِ غزل میں لفظوں کے گل دان سجاؤں کس کے لیے
مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
ان خالی کمروں میں ناصر اب شمع جلاؤں کس کے لیے

| "دیوانِ ناصر کاظمی" - ص، ۶۸۔

سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء - ناشر، حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - حیدرآباد۔

مخزونہ، کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد۔ |

یہ ہلکی پھلکی غزل ناصر کاظمی کے رنگ کو ظاہر کرتی ہے۔ انھیں محبوب سے جو وابستگی ہے اس کا اظہار اسں غزل میں عمدگی سے اور بھرپور انداز میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب میں اپنے لباسں کا کیا خیال کروں، نیالباس کیوں پہنوں اور بال کس کے لیے بناؤں، یہ سب کچھ جس کے لیے ہوتا تھا وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا۔ دھوپ ہونے کے باوجود جس کے وجود سے دل کو ٹھنڈک ہوتی تھی وہ شخص گیا اور دھوپ بھی اس کے ساتھ گئی، اب میں ان جلتی گلیوں میں کس کے لیے آوارہ پھروں۔ میں تو اسی شخص کے لیے اس شہر میں غیروں سے بھی مل لیا کرتا تھا اور اب وہ شخص ہی نہیں، ایسے ویسے لوگوں کے ناز کس لیے اٹھاؤں۔ وہ نہیں ہے تو شہر میں اس جیسا اب کوئی نہیں ہے جس کو جانِ غزل کہیں۔ ایسے میں، میں ایوانِ غزل میں لفظوں کے گلدان کس کے لیے سجاؤں۔ شہر تو شہر اب گھر کا عالم ہی کچھ اور ہے، مدت سے کوئی یہاں آیا نہ گیا۔ گھر کی فضا سن سان پڑی ہے۔ میں ان خالی کمروں میں اب کس کے لیے شمع جلاؤں۔

ناصر کاظمی کے ہاں ایسی خوب صورت مسلسل غزلیں اور بھی مل جائیں گی۔

❄

دو ایک مطلعے پیش ہیں:

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا!

GMA

["دیوانِ ناصر کاظمی" - ص ۲۲ - سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء -

ناشر: حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - حیدرآباد -]

❄

اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں تو اپنے ہونٹ سی

["دیوانِ ناصر کاظمی" - ص ۳۶ - سنہ اشاعت ۱۹۸۶ء -

ناشر: حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - حیدرآباد -]

●

وحید اختر ہمارے دور کے ذہین اور دانش ور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ فلسفہ کے استاد ہونے کے باوجود اردو شعر و ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ چناں چہ انھوں نے شعبہء فلسفہ میں جس موضوع پر ریسرچ کر کے ڈگری حاصل کی وہ فلسفے کا کم اور اردو شعر و ادب کا زیادہ موضوع ہے اور وہ موضوع ہے "خواجہ میر درد"۔ وحید اختر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کے مجموعہء کلام "زنجیر کا نغمہ" کے علاوہ ان کے دیگر مجموعوں "پتھروں کا مغنی" اور "شب کا رزمیہ" میں زیادہ تر نظمیں ہی شامل ہیں۔ "کربلا تا کربلا" تو مرثیوں پر مشتمل ہے ہی، قطع نظر اس کے وحید اختر نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور بعض بڑی متاثر کن غزلیں۔ سچ پوچھیے تو وہ دل کی نہیں دماغ کی شاعری کرتے ہیں۔ وحید اختر کے ہاں تغزل، سرشاری، شیرینی اور حلاوت نہیں ملے گی جو دیگر کئی شاعروں بالخصوص غزل گو شاعروں کے پاس پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں ایک سبک پن اور غنائیت ہے کہ پڑھنے والا متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وحید اختر کے ہاں ہر چند کہ کم ہی سہی، غزلیات مسلسل بھی ملتی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی غزل گوئی کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے۔

❄

اک غزل آج بہ اندازِ قصیدہ لکھیے
ظلم اور کذب کے اوصافِ حمیدہ لکھیے

کیجیے ان کی ثنا جتنے ہیں قشقہ بہ جبیں
جتنے ہیں اہلِ ریا ، سب کا قصیدہ لکھیے

مصلحت ہے یہی مقتول کو ظالم کہیے
قاتلوں کو ستم و درد گزیدہ لکھیے

خاک میں رلتے ہیں انمول جواہر تو رلیں
ریگ کے ذروں کو افلاک رسیدہ لکھیے

قائدِ قوم کے ہفوات کی تحسیں کیجے
ہر زے کو حاکموں کے گوہرِ چیدہ لکھیے

دیجیے جابروں کو داد بہ خونِ دل و لب
تیغ کی مدح بہ انگشتِ بریدہ لکھیے

دشمنِ جاں کو دل آرام و مسیحا کہیے
بے بصر ہیں جو انھیں مردمِ دیدہ لکھیے

افترا باندھیے ، دشنام کے لکھیے دفتر
پر حقائق کبھی دیدہ نہ شنیدہ لکھیے

گھر جلائیں ، وہ کریں قتل ، کرم ہے ان کا
ان کے اس لطف و عنایت کا جریدہ لکھیے

طبعِ نازک پہ گزرتا ہے گراں ذکرِ جنوں
اپنے دامن کو نہ دامانِ دریدہ لکھیے

| "زنجیر کا نغمہ" وحید اختر۔ ص، ۳۵-۳۶۔

سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء۔ ناشر، حسن وحید۔ زرافشاں۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔

مخزونہ، کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد۔ |

اس غزل میں اور جو بھی ہو وحید اختر کی شاعرانہ خصوصیات بہ یک نظر جلوہ گر ملتی ہیں۔ وہ ان کا تغزل سے مبرا رویہ، بات کو راست اور دو ٹوک کہنے کی کوشش، روایتی موضوعات سے ہٹ کر زندگی اور زمانے کے حال و احوال کا بیان اور غیر رسمی انداز بیان۔ اس غزلِ مسلسل کی ابتداء ہی کچھ طنزیہ انداز سے ہوتی ہے جس کا اظہار مطلع ہی سے ہوجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ آج ایک غزل قصیدے کے انداز میں لکھی جائے اور یہ قصیدہ کس کا؟ ظلم اور جھوٹ کے اوصاف حمیدہ کا قصیدہ! شاعر کے لہجے کی تلخی ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔ زندگی کے مکر و ریا، ظلم و ستم اور استحصال کو وہ نہایت بے رحمی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کی تعریف کیجیے جن کی پیشانیوں پر قشقہ کھنچا ہوا ہے۔ وہ کیسے لوگ ہیں، اہلِ ریا ہیں تو ان کا قصیدہ لکھنا چاہیے۔ زمانے کے حالات اور تقاضے کچھ یوں بدل رہے ہیں کہ مقتول کو ظالم کہنے کا وقت آچکا ہے اور قاتلوں و ستم گروں کو درد و غم سہنے والے کہنے کی نوبت آچکی ہے۔ ناقدری کا یہ عالم ہے کہ انمول جواہر مٹی میں رل رہے ہیں اور ریت کے ذرے ہیں کہ بلندیوں پر افلاک تک پہنچ چکے ہیں گویا اہل اور قابل لوگ نادار و مفلس ہیں اور جاہلوں کی بن آئی ہے۔ اب تو وہ وقت آگیا ہے کہ سربراہانِ قوم کی نااہلیوں کی ستائش کرنی ہے اور حاکموں کی بے کار اور فضول باتوں کو موتیوں کے برابر قرار دینا پڑ رہا ہے۔ جابروں اور ظالموں کو دل و جان سے داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جو انگلی تلوار کی زد میں آئی اسی کٹی ہوئی انگلی سے جابروں کی تعریف لکھنی پڑ رہی ہے۔ جان کے دشمنوں کو مسیحا کہنا پڑ رہا ہے اور جو اندھے ہیں انھیں مردم دیدہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ افترا پردازی اور دشنام طرازی کے دفتر لکھنے پر ہم سب مجبور ہیں لیکن اتنی جرات نہیں کہ جو حقائق دیکھے اور سنیں انھیں لکھا جائے۔ جو لوگ قتلِ عام کرتے ہیں بستیاں اجاڑتے اور گھروں کو جلاتے ہیں ان کی "مہربانیوں" کا اعتراف کرنا پڑتا ہے بلکہ ان کے اس لطف و عنایت کو جو دراصل ظلم و ستم ہے جرائد

میں شائع کرنے کی ذمہ داری بھی ہماری ہوتی ہے۔ اپنی دیوانگی کا ذکر اس لیے نہیں کر سکتے کہ نام نہاد حکم راں طبقے پر یہ تذکرہ بھاری گزرتا ہے اور اسی طرح اپنے دامن کو چاک لکھنے کی جرات بھی نہیں۔ یہ چیز بھی حاکمانِ وقت کے لیے ناپسندیدہ ہے۔

اس غزلِ مسلسل سے اندازہ ہوگا کہ وحید اختر نے کتنے کڑے اور احتجاجی لہجے میں زندگی اور زمانے کی چیرہ دستیوں کی تصویر کشی کی ہے انھوں نے تو اس کو ایک غزل بہ انداز قصیدہ کہا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ زندگی کا اور عصرِ حاضر کا مرثیہ ہے، کہیں کوئی حلاوت اور سرشاری کی بات شاعر کے قلم سے نہیں نکلتی۔ اس کے لہجے میں تلخی ہے، برگشتگی ہے اور ایسا زہر ہے کہ پڑھتے ہوئے خود قاری بھی شکوہ بہ لب ہو جاتا ہے۔ یہ بات خاطر نشان رہے کہ وحید اختر نے اردو شاعری کی، خاص طور پر غزل کی عام روایات سے ہٹتے ہوئے اس غزل میں عام آدمی کے درد و کرب اور بے چینی و اضطراب کو سمیٹ لیا ہے۔ وحید اختر کی اور غزلیاتِ مسلسل میں بھی ایسے ہی موضوعات، ایسا ہی اسلوب اور ایسا ہی لہجہ ملتا ہے۔

•

ادھر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سے جن شاعروں نے اپنا مقام پیدا کیا ان میں ایک شاذ تمکنت بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاذ کی شاعری فکری عنصر سے خالی ہے اور وہ صرف تراش و خراش کے شاعر ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہو تو ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاذ عصری اردو غزل کا ایک اہم نام ہے جس کی شاعری دل ہی کو نہیں دماغ کو بھی متاثر کرتی ہے۔ شاذ کے ہاں زبان و بیان، تشبیہات و استعارات اور دل کش لفظوں کا قرینہ ہے۔ شاذ کی شاعری خنکی آمیز، دھیمی دھیمی اور مدھم مدھم فضا رکھتی ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری شاذ کی غزل کے جادو میں کھو جاتا ہے۔ شاذ نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لیکن ہمارے بیش تر شاعروں کی طرح شاذ کو غزل کہنے پر جو قدرت اور مہارت حاصل ہے وہ اس دور کے بہت کم شاعروں کو حاصل ہوئی۔ شاذ کی غزلیں بالعموم مختصر ہوتی ہیں، زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نو اشعار کی، لیکن تقریباً ہر شعر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کے ہاں مسلسل غزلیں بھی مل جاتی ہیں۔ ہر چند کہ زیادہ نہیں۔ ان کی ایک مسلسل غزل ہے:

❋

کوئی گلہ ، کوئی شکوہ ذرا رہے تم سے
یہ آرزو ہے کہ اک سلسلہ رہے تم سے

اب ایک دن کی جدائی بھی سہہ نہیں سکتے
جدا رہے ہیں تو برسوں جدا رہے تم سے

فقط یہ بات کہ تم سے بڑی امیدیں ہیں
خفا نہ ہونا اگر ہم خفا رہے تم سے

قدم قدم پہ کوئی آرزو کی راہوں میں
ٹھہر کے اپنا پتہ پوچھتا رہے تم سے

تمھارے نام سے منسوب ہوگئی ہے غزل
نگارِ فن کا مقدر بنا رہے تم سے

تمھارے غم سے ہمیں کتنے کام باقی ہیں
تمام عمر یونہی جی لگا رہے تم سے

ہر ایک شخص کی ہوتی ہے اپنی مجبوری
میں اس جگہ ہوں جہاں فاصلہ رہے تم سے

ہمارے عشق کی بنیاد ہے فراق پہ شاذ
خدا کرے کہ یہ نکتہ چھپا رہے تم سے

["نیم خواب" شاذ تمکنت - ص: ۸۸ - سنہ اشاعت ١٩٧٧ء -
ناشر: نشاد کتاب گھر - معظم پورہ - حیدرآباد -]

اس غزل میں شاذ مطلع سے مقطع تک محبوب سے متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں خواہ گلے اور شکوے کی صورت

ہی میں سہی محبوب سے کوئی سلسلہ جاری رہے، بس یہی آرزو ہے۔ کبھی تو یہ عالم تھا کہ ہم محبوب سے برسوں جدا رہے لیکن اب تو ایک دن کی جدائی بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ شاذ محبوب سے کہتے ہیں کہ اگر ہم تم سے خفا ہوں تو تم خفا نہ ہونا، تم سے بڑی امیدیں ہیں جو ہم نے وابستہ کرر کھی ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ آرزو کی راہوں میں ہر جگہ تمھارا پتا پوچھا جاتا رہا۔ میں نے یہ غزل تم سے منسوب اس لیے کی ہے کہ نگارِ فن کا مقدر تم سے بنا رہے۔ اور تو اور ہمیں تمھارے غم سے بھی کئی کام لینے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ یوں ہی تمام عمر تم سے ہماری وابستگی برقرار رہے۔ اب اس کو کیا جائے ہر ایک کی اپنی مجبوری ہوتی ہے، میں بھی اس جگہ ہوں کہ جہاں تم سے میری دوری برقرار رہے۔ مقطع میں شاذ کہتے ہیں کہ ان کے عشق کی بنیاد فراق پر ہے، خدا کرے کہ یہ بات محبوب سے پوشیدہ رہے۔

•

ہمارے روایتی انداز کے غزل گو شاعروں میں سعید شہیدی کا شمار ہوتا ہے جن کی غزل میں تھوڑا بہت جدیدیت کا رنگ بھی مل جاتا ہے۔ سعید شہیدی غزل کے ممتاز شاعروں میں ہیں۔ جنھوں نے غزلیں ہی کہی اور غزلوں ہی میں اپنا مقام پیدا کیا۔ غزل کے عام موضوعات، ہجر و وصال، گل و بلبل، برق و آشیاں سرو و چمن سعید شہیدی کے ہاں نہایت طمطراق کے ساتھ موجود ہیں۔ اور انداز بیان کچھ ایسا سہل اور پر فریب کہ پڑھنے والے ہی نہیں بلکہ سننے والے بھی فوری متاثر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سعید شہیدی مشاعروں کے مقبول شاعروں میں رہے۔ غزل گو شاعر ہونے کے باوجود جن کی غزلوں کے کئی مجموعے ہیں سعید شہیدی کے ہاں غزلِ مسلسل کچھ زیادہ نہیں ملتی۔ انھوں نے کہیں کہیں ہی اس طرف توجہ دی ہے۔ ان کے مجموعہ " کفِ گل فروش " سے ایک غزلِ مسلسل ملاحظہ ہو:

❄

متاعِ بے خودی ہے آپ کا غم
شعورِ بندگی ہے آپ کا غم

میں خود کو کیسے سمجھوں بے سہارا
خدا رکھے ابھی ہے آپ کا غم
کلیجے سے لگا رکھا ہے اس کو
قرارِ واقعی ہے آپ کا غم
بہت گہرے سہی غم کے اندھیرے
مسلسل روشنی ہے آپ کا غم
شکستہ دل کو بہلانے کی خاطر
یقیناً لازمی ہے آپ کا غم
کمی اس میں کبھی ہونے نہ پائی
وہی ہم ہیں وہی ہے آپ کا غم
اسی غم کے سہارے جی رہے ہیں
ہماری زندگی ہے آپ کا غم
اس اک غم پر فدا دنیا کی خوشیاں
غرورِ آگہی ہے آپ کا غم
سعید زار کا ہے یہ عقیدہ
سرورِ سرمدی ہے آپ کا غم

["کفِ گل فروش" شاعر: سعید شہیدی - ص: ۵۷ -
سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء - ناشر: سعید شہیدی -]

اس غزلِ مسلسل کا موضوع غم ہے جو شاعر کی زندگی بھی ہے اور بندگی بھی، اس کی روشنی بھی ہے اس کی آگہی بھی۔ وہ کہتا ہے: غم بے خودی کی دولت ہے اور یہ وہ ہے جس نے سرور بندگی، بخشا ہے یہ وہ غم

ہے۔ اور اسے خدا رکھے کہ اس کی وجہ سے میں خود کو بے سہارا نہیں سمجھ پاتا۔ میں نے تو اسے کلیجے سے لگا رکھا ہے کیوں کہ محبوب کا غم وہ ہے جس نے مجھے قرارِ واقعی بخشا ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ چار سو غم کے اندھیرے ہیں اور گہرے اندھیرے مگر غم کی وجہ سے مسلسل روشنی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور ہو بھی کیوں نہیں کہ ٹوٹے ہوئے دل کو بہلانے کے لیے محبوب کا غم لازمی ہے، اس میں کبھی کمی ہوئی ہے اور نہ ہونے پائے گی۔ کیوں کہ ہم بھی وہی ہیں اور غم بھی وہی اور یہی وہ غم ہے جس کے سہارے ہم جی رہے ہیں۔ اور یہی غم ہماری زندگی ہے۔ ہم تو اس غم پر ساری دنیا کی خوشیوں کو نچھاور کردیں کیوں کہ اس غم نے تو ہم کو آگہی کا شعور بخشا ہے۔ سعید شہدی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ غم میرے لیے سرورِ سرمدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ غم کے موضوع پر غزلِ مسلسل کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو اور شاعروں کے پاس کم ہی ملے گی۔

●

بانو طاہرہ سعید ادھر خواتین شعرا میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ وہ ایسی زود گو نہ سہی تاہم ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھیں نظم اور غزل دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ فارسی زبان و ادب اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان اور شعر و ادب کا بھی ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے اسی مطالعہ کو کام میں لایا چناں چہ اس کے اثرات ان کی اردو شاعری پر بآسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ بانو طاہرہ سعید نے غزل گوئی میں اپنی راہ آپ نکالی نیز جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے ان کے شعری مجموعے میں کئی ایک ایسی غزلیں ملتی ہیں۔ میں یہاں ایک ایسی ہی غزل درج کرتا ہوں۔

❄

بچھڑ کر تجھ سے پلکوں میں نمی ہے
بھری دنیا میں کیوں تیری کمی ہے
تو ہی اک میرا سچا قدر داں تھا
تجھ ہی سے شخصیت میری بنی ہے

ترے فیضِ نظر کا تھا کرشمہ
مجھے لوگوں میں جو شہرت ملی ہے
مری تنہائیاں بھی انجمن ہیں
تری یادوں سے میری دوستی ہے
نبھائے جا اسے نعمت سمجھ کر
نشاطِ غم سے بڑھ کر کیا خوشی ہے ؟
خدا معلوم کیا کیا ہے بھگتنا
صدی اکیسویں سر پر کھڑی ہے
لگے ہے جیسے برسوں کا شناسا
اگرچہ طاہرہ ، وہ اجنبی ہے

| "دامنِ گلزار" شعری مجموعہ شاعرہ :بانو طاہرہ سعید۔
ص: ۹۴- سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء - ناشر: سوغاتِ نظر پبلیکیشنز - حیدرآباد۔ |

انھوں نے اس غزل میں رومانی انداز میں اپنی دلی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ عالمِ ہجر کا افسانہ اس غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ شاعرہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے محبوب سے بچھڑ کر پلکوں میں نمی محسوس کرتی ہیں حالاں کہ دنیا میں سب کچھ ہے لیکن اگر کوئی کمی ہے تو وہ صرف محبوب کی۔ محبوب ہی ایک سچا قدرداں تھا جس کی وجہ سے شاعرہ کی شخصیت تشکیل پائی تھی۔ محبوب ہی کے فیض کرم کا تھا کہ لوگوں میں شہرت حاصل ہوئی لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ محبوب کی یادوں سے تنہائیاں بھی انجمن لگتی ہیں اور محبوب کا دیا ہوا غم ہی خوشی بن گیا ہے کہ نعمت سمجھ کر اس سے نبھائے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں ابھی کیا کیا بھگتنا پڑے گا کہ ۲۱ ویں صدی آچکی ہے۔ محبوب ہر چند کہ اجنبی ہے لیکن شاعرہ کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے برسوں کا ساتھ ہے۔

بانو طاہرہ سعید کے اسی مجموعہ "دامنِ گلزار" میں ایک اور غزلِ مسلسل ملتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

❄

وہ تو خود ، قدرت کا ایک شہکار تھا
علم و دانش ، فکر کا معمار تھا

اس کی شخصیت "ہمالہ" سے بلند
اہلِ دل کا قافلہ سالار تھا

اپنی قسمت پر مجھے آتا ہے زعم
ایک عظیم ہستی کو مجھ سے پیار تھا

کھلکھلا دیتا تھا خفگی ، پر میری
روٹھ جانا کس قدر دشوار تھا

قہقہہ تھا ہر شکایت کا جواب
اس سے کچھ شکوہ ، گلہ ، بیکار تھا

آج ہے ویران کیوں آنگن میرا
کل جہاں پھولوں کا ایک انبار تھا

پونچھ دیتا تھا میری آنکھوں سے اشک
طاہرہ ، وہ دوست کیا غمخوار تھا

| "دامنِ گلزار" شعری مجموعہ شاعرہ :بانو طاہرہ سعید۔
ص ۳۱ ۔ سنہ اشاعت ۱۳۳۳ء ۔ ناشر: سوغاتِ نظر پبلیکیشنز ۔ حیدرآباد۔ |

یہ غزل بھی محبوب کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے اور عالم جدائی میں محبوب کی یادیں ، خوش گوار یادیں، زندگی بردوش یادیں۔ بانو طاہرہ سعید کہتی ہیں کہ وہ یعنی محبوب قدرت کا شاہکار تھا ، علم و دانش اور فن کا معمار تھا اس کی شخصیت ہمالہ سے بلند تھی ، وہ اہلِ دل کا قافلہ سالار تھا۔ اپنی قسمت پر مجھے فخر ہوتا ہے کہ اس

جیسی عظیم ہستی نے مجھ سے پیار کیا تھا۔ میں خفا ہوتی تو وہ کِھل کِھلا دیتا، یہی وجہ تھی کہ اس سے روٹھ جانا میرے لیے دشوار تھا۔ میری ہر شکایت پر وہ بس قہقہہ لگا دیتا۔ اسی لیے میں سوچتی کہ اس سے شکوہ گلہ سب بے کار ہے۔ آج وہ میرا آنگن ویران ہے لیکن کل جب محبوب تھا تو یہاں گویا پھولوں کا انبار تھا۔ اس کو مجھ سے کچھ ایسی وابستگی تھی کہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھتا تو پونچھ دیتا۔ سچ ہے کہ وہ میرا محبوب، میرا دوست، میرا غم خوار تھا۔

بانو طاہرہ سعید کے اور کئی مجموعے ہیں: "برگِ سبز"، "مہکتے ویرانے" وغیرہ جن میں چند ایک غزلیاتِ مسلسل بھی ملتی ہیں۔

•

ہمارے شاعروں میں رحمٰن جامی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، دل چسپی کا عنصر بھی ہے اور فکر کی لہریں بھی۔ فن اور زبان و بیان پر تو وہ استادانہ قدرت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایات سے جہاں وہ کما حقہ، واقف ہیں کلاسیکی شعر وادب پر بھی ان کی غیر معمولی نظر ہے۔ لیکن انھوں نے خود کو نہ روایات کا پابند بنایا نہ کلاسیکیت کے اسیر ہوئے۔ بلکہ اردو شعر وادب کی تازہ ہواؤں میں سانس لی اور نئے میلانات اور رجحانات کا خیر مقدم کیا۔ ان کی شاعری کو قدیم وجدید کا سنگم اور خوب صورت امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے "فسطاط" اور "ارغن" جیسے نام رکھے ہوں، لیکن ان کی شاعری صاف و شفاف اور رواں دواں زبان کی شاعری ہے۔ رحمٰن جامی نے لگ بھگ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے: حمد، نعت شریف، منقبت، آزاد نظم، معرا نظم، رباعیات، سانیٹ، تری یولے، مرثیہ، نثری نظم، چھند، ثلاثی، قطعات، یک شِشی، مجرا، گیت، ماہیے، دوہے اور ہائیکو لیکن سب سے زیادہ جس صنف میں ان کے جوہر کھلتے ہیں وہ ہے غزل۔ رحمٰن جامی کی غزل کو جدید غزل کہا جاسکتا ہے لیکن اگر اس کو جدید غزل نہ بھی کہیں تو یہ قدیم غزل سے تو یکسر مختلف ہے۔ سیدھے سادے الفاظ، فہم کی زد میں تراکیب، معنی خیز اشارے سمجھ میں آنے والی تشبیہات، استعارات وغیرہ۔

رحمٰن جامی نے وہ جو ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور دو غزلہ اور سہ غزلہ کہے ہیں اس سے ان کی فنِ شاعری پر غیر معمولی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ قابلِ ذکر بات تو یہ ہے دو غزلہ سہ غزلہ بلکہ چو غزلہ بھی لکھنے کے باوجود ان کے مجموعے میں غزلیاتِ مسلسل کچھ زیادہ نہیں بس چند ایک ملتی ہیں۔ ان ہی سے ایک درج کی جاتی ہے۔

❋

اس دور میں لاج شریفوں کی سچ یہ ہے ذرا محفوظ نہیں
کیا نکلیں گھر سے باہر ہم دستار و قبا محفوظ نہیں
ہر روز توازن بگڑا ہے ہر روز نیا اک جھگڑا ہے
جو آب و ہوا تھی جینے کی وہ آب وہوا محفوظ نہیں
دل میں تو تعصب ہے ان کے باہر سے جتاتے ہیں چاہت
ہے ساری سیاست ووٹوں کی وعدوں کی ادا محفوظ نہیں
ہم سے بھی پیار جتاتے ہیں ان سے بھی ہاتھ ملاتے ہیں
کچھ شرم و حیا محفوظ نہیں اب رسمِ وفا محفوظ نہیں
مالی ہی کی نیت ٹھیک نہیں رودادِ چمن بس اتنی ہے
مت پھول کھلا اب عصمتِ گل اے بادِ صبا محفوظ نہیں
جو امن کے طالب بندے ہیں کیوں جنگ مسلط ہے ان پر
اس حال میں عزت انساں کی اے میرے خدا محفوظ نہیں
کیسی ہے نمائش طاقت کی ہر دن ہی ظلم کی ظلمت ہے
سورج تو نکلتا ہے جامی سورج کی ضیا محفوظ نہیں

۱ "میکدہ" شاعر: رحمٰن جامی - ص ۲۰ -

GMA

سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء - ناشر: ادارہ اقلیم ادب - حیدرآباد۔ |

شاعر نے یہاں ردیف " محفوظ نہیں " سے خوب فائدہ اٹھایا ہے اور یہ ردیف شعر میں کچھ ایسے مناسب و موزوں اور بامعنی انداز میں استعمال کی گئی ہے کہ شعر کا مطلب دونا ہوجاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اس دور میں شریفوں کی لاج ذرا بھی محفوظ نہیں، شرفا گھر سے باہر نکلیں تو کیسے کہ ان کی دستار وقبا کے تحفظ کا تیقن نہیں۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ ہر روز ایک نیا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، حالات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ جینے کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ عناصر ہی غیر یقینی ہیں۔ ہر چند کہ ظاہری طور پر چاہت کا اظہار ہوتا ہے لیکن دل میں جو تاثر ہے وہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کیوں کہ عصری سیاست جو محض ووٹوں کے وعدوں پر زندہ ہے اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ رحمٰن جامی نے اس غزل میں عصری سیاست اور معاشرت کو خوب خوب نشانہ بنایا ہے، وہ کہتے ہیں: چاہے جانے والوں کا انداز یہ ہے کہ وہ ہم سے بھی پیار جتاتے ہیں اور اوروں سے بھی ہاتھ ملاتے ہیں گویا شرم و حیا اور رسم وفا کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ اب نہیں رہی۔ ملک کی سیاست اور سیادت بدل چکی ہے۔ وہ جو ملک کے رکھوالے تھے یعنی چمن کے مالی خود ان کی نیت میں کھوٹ آچکا ہے۔ اب پھول کھلیں تو کیا کھلیں کہ بادصبا ہی اب محفوظ نہیں۔ جو امن و اماں سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں ان پر جنگ مسلط کی جارہی ہے اور انسان کی عزت ہی محفوظ نہیں۔ یہ تو طاقتوروں کی دنیا ہے جہاں ظلم اور ظلمت کا راج ہے۔ سورج نکلنے کے باوجود سورج کی روشنی کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں۔

رحمٰن جامی کی ایک اور غزل ہے۔

❋

کیا کہیے کہ اب کیا ہوئے سچ بولنے والے
اس دور میں عنقا ہوئے سچ بولنے والے

ویسے بھی بڑی مصلحت اندیش ہے دنیا
ہر دور میں رسوا ہوئے سچ بولنے والے

ہمراہ تھی جھوٹوں کی یہاں بھیڑ ہمیشہ
ہر حال میں تنہا ہوئے سچ بولنے والے
اک تشنگی آنکھوں میں ابھی تک بھی ہے باقی
ٹوٹا ہوا سپنا ہوئے سچ بولنے والے
ہر بار گنہگاروں میں بدکاروں میں گھر کر
اپنا ہی تماشا ہوئے سچ بولنے والے
تھی سر پہ کڑی دھوپ محبت کے سفر میں
اور نیم کا سایہ ہوئے سچ بولنے والے
جب تیرہ شبی چھَٹ گئی احساس ہوا یہ
سورج کا اجالا ہوئے سچ بولنے والے
اب نام فقط ان کا ہے ہر ایک زباں پر
آپ اپنا ہی چرچا ہوئے سچ بولنے والے
حق گوئی کی منزل کا پتہ چل گیا جامی
اللہ کا رستہ ہوئے سچ بولنے والے

["میکدہ" شاعر: رحمٰن جامی - ص: ۲۷ -
سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء - ناشر: ادارہ اقلیم ادب -- حیدرآباد -]

یہ بھی وہ غزل ہے جس میں شاعر نے ردیف " ہوئے سچ بولنے والے " کو نہایت فن کارانہ قدرت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس غزل کا آہنگ زندگی کی عصری قدروں پر طنز کا بھرپور وار کرتا ہے۔ حال کی بدحالی، ماحول کے اقدار کی پامالی اور تیرہ شبی کو موضوع بناتے ہوئے شاعر ہماری تہذیب و سیاست کا خوب صورت نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ وہ دور ہے کہ کہا نہیں جاسکتا کہ سچ بولنے والے کیا ہوئے کیوں کہ

GM

ایسے لوگ تو اب عنقا ہوئے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں مصلحت اندیشی عام ہو گئی ہے، لوگ حق کو حق کہنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے سچائی کا اظہار کرنے والے رسوا ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ تو وہ ماحول ہے کہ جھوٹوں ہی کا زمانے کی اکثریت نے ساتھ دیا ہے اور سچ بولنے والے ہمیشہ یکا و تنہا رہے ہیں۔ آنکھوں کی پیاس بجھی نہیں، اب تک باقی ہے اور ایک سانحہ کہ سچ بولنے والے بکھرے ہوئے خواب کی نذر ہو گئے ہیں۔ گنہ گاروں اور بدکاروں کی اکثریت اتنی ہے کہ ان میں گھر کر سچ بولنے والے تماشے کا عنوان بن گئے ہیں۔ لیکن محبت کے سفر میں جب کڑی دھوپ سر پر آ پہنچی تو یہی سچ بولنے والے نیم کا سایہ بن گئے اور جب تاریکیاں چھٹیں تو احساس ہوا سچ بولنے والے سورج کا اجالا ہیں، سب روشن ہیں۔ جیت تو سچ ہی کی ہونی تھی اور ہوئی۔ رحمٰن جامی نے اس رخ کو نہایت عمدگی کے ساتھ غزل کا جامہ پہناتے ہوئے کہا ہے کہ اب ہر ایک کی زباں پر ان ہی کا نام ہے اور سچ بولنے والے اپنی شہادت آپ دے رہے ہیں کہ ان کو حق گوئی کی منزل کا پتہ چل گیا اور وہ راہ راست کی طرف گامزن ہوئے۔

رحمٰن جامی کی بعض اور مسلسل غزلوں میں یہ بھی ایک غزل مسلسل ہی ہے۔ اس کا مطلع ہے

❄

یہ دنیا ساتھ ہی میرے نشے میں لڑکھڑاتی ہے
میں گرتا ہوں گراتی ہے میں اٹھتا ہوں اٹھاتی ہے

["میکدہ" شاعر، رحمٰن جامی - ص: ۳۱ -

سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء - ناشر، ادارہ اقلیم ادب -- حیدرآباد -]

●

مضطر مجاز ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کا کلاسیکل شعر و ادب کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے۔ فارسی زبان اور شاعری سے غیر معمولی دل چسپی کے باعث ان کے کلام میں کلاسیکل رنگ ضرور پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جدید غزل کے اوصاف سے بھی ان کی شاعری متصف ہے۔ کلاسیکل رنگ کے

ساتھ جدید موضوعات، اسلوب اور لہجے نے ان کی ایسی شناخت بنائی ہے کہ اور شاعروں کے پاس ایسا رنگ کم ہی ملتا ہے۔ مضطر مجاز نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں جدید رنگ کچھ زیادہ ہی ہے بلکہ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جدیدیت سے متاثر ہوکر خود کو شعر گوئی پر مائل کیا ہے۔ انھوں نے اور تو اور شعر و ادب اور شاعروں و ادیبوں کے رویے، ان کے نظریات ان کی خامیوں اور خرابیوں پر بھی طنزیہ تبصرے کیے ہیں۔ ان کے لہجے میں کچھ ایسی کاٹ ہے کہ کہیں کہیں غزل روایتوں سے ہٹی ہوئی اور نئے دور کا مرثیہ بن جاتی ہے۔ شاعر اور شاعری کی بھی انھوں نے کچھ اسی طرح خبر لی ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزلِ مسلسل درج کی جاتی ہے جس سے ان کے ڈکشن کا اندازہ ہوگا۔ غزل ہے

❄

اگ رہی ہیں، قحط غزلوں کا نہیں
بھُک مری کا کوئی اندیشہ نہیں!
چل رہے ہیں کارخانے شعر کے
کونسا ہے مال جو گلتا نہیں
وزن بھی ہے، قافیہ بھی، بحر بھی
شعر کہتے ہیں جسے ملتا نہیں
لفظ ہیں، لفظوں کے پیچھے لفظ ہیں
لفظ لیکن ایک بھی زندہ نہیں
کہہ گئے ہیں "شعر چیزے دیگر است"
وہ شئے دیگر ہے کیا، کھلتا نہیں

["اک سخن اور" شاعر، مضطر مجاز۔ ص، ۲۳۔
سنہ اشاعت ۱۹۸۸ء۔ ناشر، مکتبۂ شعر و حکمت۔]

یہ غزل دراصل شاعروں اوران کی شاعری پر، شاعری کی افراط اور غزلوں کی بہتات پر خاصا کاری طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تو غزلوں کا قحط نہیں اور نہ بھُک مری کا اندیشہ ہے کیوں کہ جدھر دیکھیے غزلیں ہی غزلیں اگ رہی ہیں۔ غزل گوئی کی زیادتی پر اس سے بہتر طنز اور کیا ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جدھر دیکھیے شعر کے کارخانے ہیں اور ہر طرح کا مال موجود ہے۔ قابلِ ذکر بات تو ہے کہ وزن بھی ہے، قافیہ بھی اور بحر بھی لیکن جسے شعر و شاعری کہتے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ الفاظ کی کمی نہیں، لوگ الفاظ کو منظوم تو کرلیتے ہیں لیکن کوئی لفظ بھی زندگی بخش محسوس نہیں ہوتا۔ ساری شاعری گویا مردہ ہے۔ آخر میں تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ شعر چیزے دیگر ہے لیکن یہ دوسری چیز کیا ہے کوئی بھی بیان کرنے سے قاصر ہے۔

●

جعفر رضا بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہیں۔ ہندی زبان و ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ چناں چہ خاص طور پر فکشن اور اس میں پریم چند پر ان کا کام وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان دنوں ہمارے بیش تر ناقدین اور محققوں نے جو شاعری پر توجہ دی ہے ان میں گیان چند جین، آل احمد سرور، وغیرہ کی طرح جعفر رضا بھی ہیں۔ جعفر رضا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی تھی۔ بہت سی چیزیں مختلف رسائل میں شائع ہوئیں"۔ چناں چہ انھوں نے شاعری کی تجدید کی اور اپنی شاعری کا انتخاب "برف کی آگ" کے بہ عنوان شائع کیا۔ برف کی آگ میں غزلیں بھی ہیں اور دوہے بھی لیکن ظاہر ہے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جعفر رضا نے شاعری پر پوری توجہ نہ دی ہو لیکن اس خصوص میں انھوں نے سنجیدگی سے کام ضرور لیا ہے۔ جعفر رضا کے چند سال کشمیر میں بھی گزرے چناں چہ کشمیر کی روح پرور فضاؤں، کیف انگیز ہواؤں کا ان کی شاعری پر اثر آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کشمیر کے قدرتی حسن کی بھی جلوہ آرائی ہے اور انسانی حسن کی بھی۔ وہ ان مناظر میں ڈوب کر ہی نہیں بلکہ اپنے من میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ فنی نزاکت ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو ایک سرور آگیں کیفیت سے ہم آہنگ کردیتی ہے۔ ان کے ہاں لہجے میں نزاکت بھی ہے اور تلوار کی تیزی بھی۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر لکھا ہے: جعفر رضا

کے اشعار ہی حسن، کیفیت اور شعریت سے بھرپور نہیں، ان کے بادہ ء سخن میں پختگی بھی اور شمشیر کی سی تیزی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے اشعار متوجہ کرتے ہیں بلکہ قاری کے دل میں اپنی جگہ بنالیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر غزل گو کے ہاں غزلِ مسلسل بھی ملے لیکن مسلسل غزلوں سے بہت کم شاعروں کا دیوان مبرا ہے۔ جعفر رضا نے بھی اپنے مختصر شعری سرمائے کے باوجود غزلِ مسلسل پر توجہ دی ہے۔ یہاں ان کی ایک غزلوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

❄

وہ، اک سحاب تھا، سایہ کیے رہا مجھ پر
وہ، ابرِ نیساں تھا، اکثر برس گیا مجھ پر
وہ، جب خفا ہوا، نرمی کے ساتھ کہتا تھا
تو، عادتوں میں بڑی حد تلک گیا مجھ پر
چلا گیا وہ، ہواؤں کے دوش پر تنہا
مثالِ صبح، کرن سی، بکھیرتا مجھ پر
وہ، دوستوں میں سزاوارِ جرمِ عشق رہا
وہ، رمزِ ذاتِ بشر، کھول کر گیا مجھ پر
وہ، خوش گوار تھا، دل کا گلاب کھل اٹھا
وہ، پر بہار تھا، خوشبو لٹا گیا مجھ پر
بڑا رفیق تھا، ہر حال میں رہا، دمساز
بہت شفیق تھا، شفقت بنا رہا مجھ پر
بتا کے، خاکِ درِ بوترابؑ کی تاثیر
کیے علوم و ترقی کے باب وا مجھ پر

GM

وہ ، بات بات پہ ہر دم نثار کرتا رہا
انانیت و کرم و بخشش و عطا مجھ پر

["برف کی آگ" شاعر : جعفر رضا ۔ ص : ۶۱ ۔

سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء ۔ ناشر : جعفر رضا ۔ الہ آباد ۔]

یہ غزل جعفر رضا نے اپنے مرحوم والد کی یاد میں تحریر کی ہے ۔ حزن و غم کی فضا مطلع سے مقطع تک چھائی ہوئی ہے ۔ شاعر کے جذبات شدت کے ساتھ ابھرتے جاتے ہیں ۔ وہ اپنے والد کو یاد کرتا ان کے اوصاف بیان کرتا ، ان سے جذبہ و تحریک لیتا اور ان کے کردار کو عام کرنا چاہتا ہے ۔ اس غزل میں وہ کہتے ہیں ۔ ان کے والد کی حیثیت بادل کی سی تھی جس کا ان پر سایا رہا ، یہ بادل ابر نیساں تھا جو ان پر برس گیا ۔ والد جب خفا ہوتے تو نرمی کے ساتھ کہتے کہ "تو (جعفر رضا) عادتوں میں بڑی حد تک مجھ پر گیا ہے " جعفر رضا کہتے ہیں کہ ان کے والد ہواؤں کے دوش پر تنہا چلے گئے اور صبح کی طرح ان پر روشنی بکھیر تے رہے ۔ وہ اپنے دوستوں میں سزاوار جرم عشق رہے لیکن انھوں نے ایک انسانی حقیقت کا راز اپنے بیٹے پر کھول دیا ۔ وہ خوش مزاج ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے دل کا گلاب کھل جاتا ۔ وہ ایسی بہار تھے کہ جس نے اپنے بیٹے پر خوش بو لٹادی ، وہ اپنے بیٹے کے رفیق بھی رہے اور دم ساز بھی اور ہمیشہ مجسم شفقت بنے رہے ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو حضرت علیؑ کی خاکِ در کی تاثیر بتائی اور علوم و ترقی کے دروازے کھولے ۔ والد ایسے تھے کہ ہر وقت ہر بات پر عنایت و کرم سے پیش آتے اور بخشش و عطا سے فیض یاب کرتے ۔

•

عصر حاضر کے شاعروں میں جنھوں نے لکھا اور بہت زیادہ لکھا ہے ان میں ایک علیم صبا نویدی بھی ہیں ۔ علیم صبا نویدی الفاظ کے انتخاب ، مصرعوں کے در و بست ، تشبیہات و استعارات کے استعمال اور ردیف و قافیے کے سبب قاری کو فوراً متوجہ کرلیتے ہیں ۔ ان کا پیرایہ ، بیان ، لہجہ اور اسلوب بھی کچھ ایسا طرح دار اور پر کشش ہوتا ہے کہ نظر ٹھہر ٹھہر جاتی ہے اور سننے والا بھی اپنی سماعت میں رس گھلتا محسوس کرتا ہے ۔

اسی کے ساتھ علیم صبا نویدی نے اردو غزل کے زیادہ تر موضوعات کو کام لانے کے باوصف اپنے طور پر نئے موضوعات، عنوانات اور مسائل تلاش کرلیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز شاعری کی اس گرم بازاری میں آسانی سے پہچانی جاتی ہے۔ اور انھوں نے بہ تدریج اپنی شناخت انھیں اسباب کے تحت قائم کرلی ہے۔ علیم صبا نویدی نے نظمیں بھی کہی ہیں، ہائیکو، ماہیے، تری یولے اور آزاد غزل وغیرہ کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ لیکن ان کی غزل ان ساری اصناف کے مقابلے میں دل کش اور دل آویز ہے۔ علیم صبا نویدی زود گو ہیں۔ ان کی شاعری کے تاحال کئی مجموعے اور انتخابات وغیرہ شائع ہوچکے ہیں۔ تاہم غزل اردو شاعری ہی کی نہیں علیم صبا نویدی کی شاعری کی بھی آبرو ہے۔ غزل مزاج ہونے کی وجہ سے علیم صبا نویدی کے ہاں غزلوں میں نظموں کی کیفیت یا غزلِ مسلسل کا انداز کم ہی ملتا ہے۔ چناں چہ ان کے شعری مجموعوں کے گہرے مطالعے کے باوجود چند ایک غزلِ مسلسل ہی ہاتھ لگی ہیں۔ ان کی ایک غزلِ مسلسل ہے:

❄

میں آفتابِ صبحِ تمنّا کا فرد ہوں
جو آسماں کے شہر سے نکلا وہ مرد ہوں

احساس میرا شعلہء دوزخ کا ہم مزاج
مانا میں گفتگو کے جزیرے میں سرد ہوں

میری شناخت کون کرے گا کہ اب بھی میں
اجڑے ہوئے دیار کی نادیدہ گرد ہوں

مجھ میں اتر کے میرا کوئی جائزہ بھی لے
اندر سے سبز اور میں اوپر سے زرد ہوں

سات آسمان اوڑھے ہوئے سر خوشی کے میں
سانسوں کی کائنات کا خاموش درد ہوں

GM

["فکر بر" شاعر: علیم صبانویدی - ص، ۵۱ -

سنہ اشاعت جون ۱۹۸۱ء - ناشر: ٹامل ناڈو اردو پبلیکیشنز -]

علیم صبانویدی کہتے ہیں کہ میرا تعلق صبحِ تمنّا کے آفتاب سے ہے اور میں وہ شخص ہوں جو آسماں کے شہر سے نکلا ہے۔ میرا احساس شعلہء دوزخ سے ہم مزاج ہے ہرچند کہ میں گفتگو کے جزیرے میں سرد ہوں۔ مجھے پہچانتا مشکل ہے کہ میں اجڑے ہوئے دیار کی اَن دیکھی گرد ہوں۔ کوئی میرے وجود اور درون کا جائزہ لے تو مجھے اندر سے سبز اور اوپر سے زرد پائے گا۔ سبز اور زرد رنگوں سے یہ معنویت پیدا کی گئی ہے کہ اوپر سے میں زرد یعنی بیمار سا دکھائی دیتا ہوں لیکن اندر میری شخصیت سبز یعنی تر و تازہ ہے۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ میں سرخوشی کے ساتھ آسمان اوڑھے ہوئے ضرور ہوں لیکن میری سانسوں میں کائنات کا خاموش درد پنہاں ہے۔

علیم صبانویدی کی ایک اور غزلِ مسلسل ہے:

❄

یہ میری راہ گذر پر غبار سا کیوں ہے
اداسیوں میں پگھلتا دیار سا کیوں ہے
بہت سی اور چٹانیں ہیں سر بلند یہاں
مرے ہی سر پہ یہ گردوں سوار سا کیوں ہے
میں اجنبی ہوں ازل سے غزل کے گھر میں مگر
یہ لاشعور مرا رشتہ دار سا کیوں ہے
وصال تیرا وصالِ زمردیں ہے مگر
ہمارے حق میں یہی کوہسار سا کیوں ہے
جو گنگناتی رتیں قتل ہوگئیں ہیں صبا
انھی رتوں کا تجھے انتظار سا کیوں ہے

["طرحِ نو" شاعر، علیم صبانویدی - ص، ۲۳ -

سنہ اشاعت جون ۱۹۷۵ء - ناشر، ٹامل ناڈو اردو پبلیکیشنز -]

علیم صبا نویدی کہتے ہیں: ایک دھند اور غبار کی سی کیفیت میری راہ گزر پر کیوں چھائی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرا دیار اداسیوں میں پگھل رہا ہے۔ ہر چند کہ یہاں اور سر بلند چٹانیں بھی ہیں لیکن یہ آسمان میرے ہی سر پر سوار کیوں ہے۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی مصیبتیں میرے ہی سر پر سوار ہیں۔ اگر چہ میں غزل کے گھر میں ازل سے اجنبی ہوں لیکن لاشعوری طور پر غزل سے میرا رشتہ استوار لگتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تیرا وصال وصالِ زمرد میں ہے مگر ہمارے لیے یہ ایک پہاڑ ہے جس کا سر کرنا آسان نہیں۔ مقطع میں علیم صبا نویدی کہتے ہیں جو رتیں گنگناتی ہوئی تھیں وہ تو قتل ہو گئیں لیکن ہم ہیں کہ آج بھی ان کے انتظار میں لگے ہوئے ہیں۔ علیم صبا نویدی کے ہاں جو اور چند غزلیں پورے طور پر غزلِ مسلسل نہ سہی غزلِ مسلسل کی کیفیت لیے ہوئے ملتی ہیں ان کے مطلع پیش ہیں:

❄

سرحد سے کائنات کی نکلا ہوا تھا میں
سورج کو اپنے ہاتھ سے تھاما ہوا تھا میں

❄

جلا کے اپنے بدن کو دھواں ہوا تھا میں
بکھر بکھر کے زمان و مکاں ہوا تھا میں

❄

کسی کا داخلہ دشوار ہے مرے اندر
کہ میری ذات ہی دیوار ہے مرے اندر

❄

رتوں کی آگ میں عنبر فشاں ہوئے ہم لوگ
گلوں کی چھاؤں میں جل کر جواں ہوئے ہم لوگ

[" اثرِ خامہ " شاعر: علیم صبانویدی - ص: ۵۶ - ۶۶ - ۶۸ - ۷۶
سنہ اشاعت جون ۱۹۹۱ء - ناشر: ٹامل ناڈو اردو پبلیکیشنز -]

❄

میٹھی زباں سے کڑوی دعا دے رہے ہیں لوگ
بن موسموں کے پھل کا مزا دے رہے ہیں لوگ

[" فکرِ بر " شاعر: علیم صبانویدی - ص: ۱۵۸ - ۱۵۹ -
سنہ اشاعت جون ۱۹۸۱ء - ناشر: ٹامل ناڈو اردو پبلیکیشنز -]

❄

میں آگ بن کے جو پانی سمیٹ لایا ہوں
نئے ادب کی جوانی سمیٹ لایا ہوں

[" طرحِ نو " شاعر: علیم صبانویدی - ص: ۶۵ -
سنہ اشاعت ۱۹۷۵ء - ناشر: ٹامل ناڈو اردو پبلیکیشنز -]

●

اردو میں غزلِ مسلسل کا یہ غیر معمولی تفصیلی نہ سہی تاہم خاصا بسیط جائزہ ضرور ہے۔ اردو میں اول تو شاعری ہی پر خاصی توجہ دی گئی ہے اور دیگر اصناف کے مقابلے میں غزل پر کہیں زیادہ۔ تمام تر اردو غزل گو شاعروں کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اس بحرِ بے کراں کے لیے بلاشبہ سفینہ چاہیے بلکہ کچھ اور اس لیے میں نے سعی کی ہے کہ ہر دور کے نمائندہ اور ممتاز شاعروں کے ہاں غزلِ مسلسل تلاش کروں اور ان پر اظہارِ خیال کروں۔ اس لیے یہاں دبستانِ گولکنڈہ سے لے کر عصرِ حاضر تک کے منتخبہ شاعروں کی غزلوں کا گہرائی کے

GM

ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ مختلف مزاج کے شاعروں کی مسلسل غزلیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ میرا مطمحِ نظر صرف مسلسل غزلوں کا مطالعہ اور ان کا تجزیہ رہا ہے۔ میں نے شاعروں کے نظریات اور ان کے نقاطِ نظر کے حوالے کہیں کہیں دیے ہیں، یہ اور بات ہے لیکن شاعروں کے نظریات وغیرہ سے میں نے واسطہ نہیں رکھا۔ یہ بات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے کہ فی زمانہ مسلسل غزلوں پر توجہ کم دی جارہی ہے۔ اس کے وجوہ اور جو بھی ہوں، نظم نگاری کا فروغ بھی ہوسکتا ہے۔ جب کسی بات یا واقعہ یا منظر وغیرہ کو نظم کے پیرایے میں تسلسل کے ساتھ بہ آسانی بیان کیا جاسکتا ہے تو غزل کا پیرایہ کیوں اختیار کیا جائے۔ حالاں کہ موجودہ غزل وہ غزل نہیں رہی جو کبھی تھی۔ روایتی غزل کے خدوخال اور تھے۔ موضوعات اور تھے۔ عصری غزل میں زندگی اور زمانے کی باتیں کتنی ہی بیان کی جاتی ہوں لیکن غزل بہر کیف غزل ہے۔ منتشر خیالی یا گلدستہ کی کیفیت اس کی سرشت ہے۔ چناں چہ موضوعات خواہ کوئی اختیار کیے جائیں منتشرالخیالی سے مبرا ہونا ممکن نہیں۔ اسی لیے خاص طور پر فی زمانہ مسلسل غزلیں کم ملتی ہیں۔ تاہم عصرِ حاضر میں بھی مختلف ادبی نظریات رکھنے والے شاعروں کے کلام میں مسلسل غزلیں تلاش کیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزل کے اس شیڈ سے بے تعلقی غزل گو شاعروں سے ممکن نہیں۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت سے وابستگی رکھنے والوں کے ہاں بھی مسلسل غزلیں ملتی ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی۔ جن کا مطالعہ یہاں شامل ہے۔

اردو میں شاعری پر اور شاعری میں تخصیص کے ساتھ غزل پر مختلف زاویوں سے کام کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اردو میں غزلِ مسلسل کے موضوع پر اِدھر اُدھر تذکرہ آیا ہو یا ایک آدھ مضمون لکھا گیا ہو، کوئی مبسوط کام نہیں کیا گیا۔ الحمدللہ یقین ہے کہ میری اس کاوش کو درجہ ءِ قبولیت حاصل ہوگا۔

○●○

(باب : آٹھ)

اختتامیہ

◆◆◆

اردو میں غزلِ مسلسل کی روایت نہایت قدیم ہے۔ غزل بجائے خود فارسی شاعری کی دین ہے۔ اردو زبان نے صنف غزل کے ساتھ ساتھ اس صنف کی ساری روایات بھی فارسی سے مستعار لیں۔ غزل کی مشہور زمانہ "ریزہ خیالی" اور "ریزہ کاری" کے باوجود جو غزل کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ فارسی شعراء نے ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں نظم کی طرح از مطلع تا مقطع ایک ہی خیال ایک ہی موضوع یا ایک ہی جذبہ کا ابلاغ ہوا ہے۔ چناں چہ سعدی اور حافظ کے علاوہ امیر خسرو کے ہاں بھی اس طرح کی غزلیں ملتی ہیں۔ بعد میں ان کے لیے "غزلِ مسلسل" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ چوں کہ اردو زبان میں تخلیقی ادب کا آغاز دکنی سے ہوا اس لیے متعدد اصناف کی طرح غزل کے اولین ارتسامات بھی دکنی زبان کے شعرا ہی کے یہاں ملتے ہیں۔ قدیم دکنی غزل گو شعراء کے سرمایہ کے تحقیقی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان شعرا نے غزلِ مسلسل کی روایت کو شعوری طور پر برتا ہے۔ چناں چہ محمد قلی سے ولی تک، دکنی کے اہم غزل گو شعراء کے ہاں غزلِ مسلسل کا ایک آدھ نمونہ بالالتزام ملتا ہے۔ ادھر شمالی ہند میں عہدِ میر سے ناسخ و غالب تک اور حالی سے اقبال تک پھر ترقی پسند تحریک سے عصر حاضر تک کے شعرا تک غزلِ مسلسل کی روایت کا سفر بغیر کسی انقطاع کے جاری و ساری نظر آتا

ہے۔ جس کے نتیجے میں اردو میں غزلِ مسلسل کا بہ اعتبار کمیت نہایت وسیع اور بہ اعتبار کیفیت نہایت وقیع ذخیرہ جمع ہو گیا۔

غزل کی ہیئت اور اس کا سانچہ اور بنیادی فنی تقاضے ہر دور میں بڑی حد تک ایک جیسے رہے ہیں لیکن غزل گو شعرا کا فکری منہاج اور زبان و اسلوب سماجی، سیاسی اور معاشرتی انقلابات کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتا رہا ہے۔ غزل کی یہی لچک اس کی زندگی اور پائیداری کی علامت ہے۔ دور حاضر میں غزل میں کئی تجربے کیے گئے جیسے نثری غزل، آزاد غزل، اینٹی غزل وغیرہ لیکن ان تجربوں کو قبولیت عام حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غزل میں تجربوں کی گنجائش نہیں۔ بلکہ تجربے ہونا چاہیے۔ اگر کوئی تجربہ صالح ہو گا، توانائی اور امکانات سے پر ہو گا اور اس میں اثر و نفوذ کی صلاحیت ہوگی تو اسے دنیائے ادب میں استناد حاصل ہو جائے گا۔

غزل بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہے غیر مسلسل اور مسلسل۔ مسلسل غزل وہ ہے جس کے سب اشعار سلسلہ بہ سلسلہ ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔ جب کہ غزل غیر مسلسل میں ہر شعر جدا گانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے اور ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزلِ مسلسل میں تسلسل کی بنیاد دو طرح کے عناصر پر قائم ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ غزل میں مضمون کا تسلسل ہوتا ہے یعنی اس میں شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون بیان کیا جاتا ہے لیکن اس میں ارتباط یا تسلسل صرف اس زاویہ سے ہوتا ہے کہ محض مضمون کی تکرار ہوتی رہتی ہے یعنی ایک ہی بات مختلف اشعار میں پیرایہ بدل بدل کر بیان کیا جاتا ہے۔ غزلِ مسلسل کا دوسرا عنصر مضمون کے ارتقا سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی اس میں صرف مضمون کی تکرار نہیں ہوتی بلکہ تسلسل خیال کے ساتھ ساتھ ارتقائے خیال بھی پایا جاتا ہے۔ گویا خیال کا سلسلہ آنے والے ہر شعر میں آگے بڑھتا ہے اور اسی طرح مقطع تک وسعت پاتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس باب میں غزلِ مسلسل اور عام غزل کے قطعہ بند اشعار کے فرق کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ جب شاعر اپنے مافی الضمیر کو اختصار کے ساتھ دو مصرعوں میں پیش نہیں کرتا بلکہ اسے پھیلا کر دو یا دو سے زیاہ اشعار میں پیش کرتا ہے تو ان مسلسل اشعار کو قطعہ کہا جاتا ہے اور مجموعی طور پر یہ اشعار قطعہ بند کہے جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ قطعہ بند اشعار عام غزلوں کی طرح جدا گانہ مفہوم کے حامل نہ ہوں

گے بلکہ ہر شعر ایک دوسرے سے یوں ملا ہوا ہو گا جیسے کسی زنجیر کی کڑیاں۔

غزل پر بعض ناقدین نے سخت اعتراضات کیے ہیں جس کا آغاز حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوتا ہے اس کے بعد جوش، عظمت اللہ خان اور کلیم الدین احمد نے غزل کی ہیئت پر شدید اعتراضات کیے۔ جوش نے تو اسے قابلِ گردن زدنی قرار دیا اور کلیم الدین احمد نے اسے "نیم وحشی صنفِ سخن" کہا۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا معروضہ ادب یہ ہے کہ غزل کے بیشتر مخالفین کے اعتراضات غزلِ غیر مسلسل پر اگر درست ثابت ہو بھی جائیں تو غزلِ مسلسل پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس میں غزلِ مسلسل کی طرح معترضین کی مطعون کردہ "انتشار خیالی" اور "پریشان فکری" نہیں پائی جاتی۔

جب ہم اردو شاعری میں غزلِ مسلسل کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے دبستان گولکنڈہ پر پڑتی ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی کلیات میں غزلِ مسلسل اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ محمد قلی کی کلیات میں جن تخلیقات پر کوئی عنوان چسپاں کرکے انھیں نظم قرار دیا گیا ہے وہ دراصل نظم نہیں بلکہ غزل ہیں اور غزل مسلسل ہیں۔ اصل مخطوطات میں ان تخلیقات پر کوئی عنوانات نہیں ہیں۔ مرتبین نے ان پر عنوانات چسپاں کیے ہیں جس کی وجہ سے ان غزلوں پر نظموں کا گمان ہوتا ہے۔ چناں چہ پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

> "محمد قلی کی نظمیں ہیئت کے اعتبار سے غزلیں ہیں۔ محمد قلی نے انھیں غزل ہی کے نام سے یاد کیا ہے لیکن انھیں مرتبین (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر سیدہ جعفر) نے ردیف وار دیوان میں شامل نہیں کیا ہے۔ چوں کہ تسلسل اور موضوع کے اعتبار سے انھیں نظمیں گردانا جاسکتا ہے اس لیے ڈاکٹر زور (اور ان کے تتبع میں بعد کو سیدہ جعفر نے بھی) انھیں عنوانات دے کر کلیات کا پہلا حصہ بنا دیا ہے۔"

[پروفیسر مسعود حسین خان - محمد قلی قطب شاہ - دہلی - ۱۹۸۸ء - ص ۳۵۰]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیاتِ قلی میں شامل تمام نظموں کو پروفیسر مسعود حسین خاں غزل

سمجھتے ہیں لیکن یہ عام غزل کی طرح ریزہ خیالی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ غزلِ مسلسل ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

"غزل اس کی (محمد قلی کی) محبوب صنف سخن بن گئی، یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ہم نظم کہتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت لکھی ہوئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔"

[ڈاکٹر محمد علی اثر۔ دکنی غزل کی نشو ونما۔

ص۔۱۲۵۔ سنہ اشاعت اور مقام، ۱۹۸۶ء حیدرآباد]

کلیات محمد قلی قطب شاہ میں مختلف تہواروں مثلاً بسنت، میلاد النبی، نو روز وغیرہ پر جو نظمیں ہیں وہ دراصل غزلِ مسلسل ہیں۔ کلیات محمد قلی کے حصہ دوم یعنی غزلیات کے حصہ میں بھی متعدد غزلیں، غزلِ مسلسل ہیں۔ محمد قلی کی ایک غزلِ مسلسل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

بسنت کھیلیں عشق کا آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نچھل کندن کے تاراں انگ چھونا
بندی ہوں چھند ہندسوں کر سنگارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی دبستان گولکنڈہ کا ممتاز شاعر رہا ہے۔ اس کی شاعری میں اپنے نانا کے کلام کی طرح حسن اور عشق اور ہجر و وصال (بلکہ زیادہ تر وصال ہی) کے موضوعات ملتے ہیں۔ اس کا کلیات ہر چند کہ مکمل شائع نہیں ہوا لیکن جو بھی منظر عام پر آیا ہے اس میں غزلِ مسلسل کی تلاش کرتے ہوئے راقم الحروف نے اس کا معروضی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

یاری لگی ہے پیاری ناری توں سج آنا
بھانا توں بھوت کرتی تو کیوں توں دل کو بھانا
ہاں نانچ کرتے لےَ دن ہوکر گئے سہیلی
آناں مرے کنے ٹک کِتّا کرے گی نانا
سہیلیانچ میں سہیلی گر دینے جیو ہوتا
پردا نتیں اقل کی عاشق اہے دوانا

اسی طرح ملک الشعرا غواصی کا کلام بھی دبستان گولکنڈہ کا وقیع شعری سرمایہ ہے۔ غواصی نے مثنویاں وغیرہ بھی لکھی ہیں لیکن اس کی غزلیں غضب ڈھاتی ہیں۔ جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے غواصی نے گل و بلبل کے موضوعات ہی کو لیتے ہوئے غزلِ مسلسل میں نیرنگی پیدا کردی ہے۔

نہیں سد منج کوں عالم کی کہ بے سد ہو رہتا ہوں میں
سنی نتیں بات منج کس کی کہ دائم اپ سٹا ہوں میں
کہاں تھا کاں تھے آیا ہوں یو کچ فام نتیں ہوتا
پھراتا تیوں وو پھرتا ہوں رکھے تیوں دوڑتا ہوں میں
تمام اس من منے سیر کتا ہے وو اپچ ہوں کر
نہ کچ یو میں کتا ہوں جیوں کتا وو تیوں کتا ہوں میں

دبستان گولکنڈہ کے دیگر شاعروں مثلاً احمد، عاجز اور ابنِ نشاطی وغیرہ کے پاس بھی غزلِ مسلسل کا سرمایہ ملتا ہے۔

عادل شاہی سلاطین نے نہ صرف شعروادب کی سرپرستی کی ہے بلکہ خود بھی معرکہ کے شعر کہے ہیں۔ علی عادل شاہ شاہی کے مختصر کلیات میں غزلِ مسلسل موجود ہے جو نہایت مرصّع ہے اس میں خیال ابتدا سے انتہا تک مربوط ہے۔

تجھ گال پر نکھ کا نشان دستا ہے مج اس دھات کا
روشن شفق میں جلمگے جیوں چاند پہلی رات کا
تج زلفِ مشکیں دیکھ کر سانپاں تجے ان پان سب
تج لب کیری لالی انگے لالاں نٹے سدگات کا
ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشاں تج بات کا

میراں ہاشمی، دبستانِ بیجاپور کا ایک پرُ گو سخنور اور شاعرانہ ہنر مندی کا حامل فن کار تھا۔ اپنی ریختی گوئی کے لیے یہ معروف ہے ہی لیکن اس کی مسلسل غزلیں بھی متوجہ کرتی ہیں۔

پیاسا ہوں میں کئی روز سوں تجھ مہر کے پھل نیر کا
شربت میٹھا لب سوں میٹھے دے ہر میٹھی تقریر کا
دل خوش ہو آتا ہے ہنسا گوری ترا مکھ دیکھ کر
رنگ زعفراں کا باغ توں مانند لیتی کشمیر کا
جو بن ترے گالاں تھڈی اور جھڑتے دیکھا ہے جو کوئی
ہرگز نہ لے گا ناؤں پھر نارنج، سیب، انجیر کا

عادل شاہی سلطنت کے آخری دور کے شاعر معظم بیجاپوری کا شعری سرمایہ زیادہ تر مثنویات پر مبنی ہے لیکن چند ایک نظموں اور قصیدوں کے علاوہ اس کی غزلیں بھی قابلِ قدر ہیں۔ معظم نے مسلسل غزلوں کی سمت بھی توجہ دی ہے۔ چناں چہ اس کے مجموعے میں غزلِ مسلسل سے دل کشی پیدا ہوتی ہے۔

پیارے کی جدائی سے مجھے گھردار نئی بھاتا
نہ مجھ کو کام خوش لگتا سگل سنسار نئی بھاتا
سکیاں سب دل بہلانے کو مرے گفتار ہیں کرتیاں

مٹھیاں باتاں بوریاں لگتیاں سواد گفتار نئی بھاتا
مجھے ابرن پہنے سوں سینے میں آگ لگتی ہے
لگانا تن کو خوش بوئی پھولوں کا ہار نئی بھاتا

حسن شوقی وہ شاعر ہے جس سے دبستانِ بیجا پور کا شعری وقار بلند ہوتا ہے۔ اس کی غزلیں ہر اعتبار سے دبستانِ دکن کی نمائندہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

تجہ مکہ کنول کنولے بدل جگ میں سو رنگ لالا ہوا
تجہ زلف تھی اپچی بہنور دو جی بہونگ کالا ہوا
تجہ نین تھی نرگس کھلی عبہر کھلی بنکش پھلی
تجہ خوئی تھی دونا ہوا ، مروا ہوا ، بالا ہوا
تجہ بال کالے رات ہور بالا سو کہتے دیس ہے
تجہ بال ہور بالا مگر ہنگام چڑ کالا ہوا

گولکنڈہ اور بیجا پور کے بعد دبستانِ اورنگ آباد نے بھی اردو شعر و ادب کے ارتقاء میں اہم حصہ لیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ولی اردو غزل کا باوا آدم نہیں۔ ولی کی غزلیں بہ ہر زاویہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ولی نے غزل مسلسل پر بھی توجہ دی اور بڑی خوبصورت غزلیاتِ مسلسل کہی ہیں۔

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نئیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

ولی کے بعد جس شاعر نے اورنگ آباد کے وقار کو برقرار رکھا وہ سراج ہے۔ کہتے ہیں سراج نے تصوف سے اپنی دل چسپی کے باعث ایک مختصر مدت کے علاوہ شاعری پر توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر بھی کلیاتِ سراج ان کی عظمت کو منوانے کے لیے کافی ہے۔ سراج نے بڑی خوبصورت مسلسل غزلیں کہی ہیں ان کو پڑھتے ہوئے کیف کا عالم طاری ہوتا ہے۔

آفتِ جاں ہے تمھاری بے حجابی اے صنم
مجھ کوں بے ہوشی ہے تم کو نیم خوابی اے صنم
رشتہ ء امید تیغ ہجر سیں ہوتا ہے قطع
ناامیدی کوں خجل کر ، آشنائی اے صنم
آشنائی سیں دگر نہ مجلسِ عشاق میں
ظلم ہے ، غم ہے ، قیامت ہے ، خرابی اے صنم

داؤد اورنگ آبادی کا نام اور کلام بھی دبستان اورنگ آباد میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ولی اور سراج کے بعد دبستانِ اورنگ آباد میں شعر و سخن کی روایت کو آگے بڑھانے میں داؤد کا اہم حصہ رہا۔ داؤد کو گو شہرت نہ ملی ہو لیکن ان کی مرتبت سے انکار ممکن نہیں۔ داؤد کی غزلِ مسلسل کے چند اشعار دیکھیے:

جب سوں کیا لباس وو گل پیرہن ہرا
یک بارگی دکھا کے چھب عاشق کا من ہرا
کس رنگ سوں کھڑا ہے زمرد لباس ہو
پرتو سوں جس کے مثل چمن ہے صحن ہرا
وو سرو جامہ زیب پہن کر لباس سبز
کس طرز سوں کھڑا ہے جیوں سروِ چمن ہرا

شمالی ہند کے غزل گو شعراء میں میر سر آمد حلقہء سخنوراں ہیں۔ میر کے کلیات میں غزلِ مسلسل کی کئی

مثالیں مل جاتی ہیں۔ میر کی مسلسل غزلیں اپنے موضوع کے علاوہ فنّی اور ادبی زاویے سے نہایت وقیع ہیں۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
ایک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

عہد میر کے ایک اور اہم غزل گو شاعر کا نام خواجہ میر درد ہے جو اپنی شاعری سے زیادہ اپنے صوفیانہ مسلک کے باعث اردو ادب کی تاریخ میں عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ درد کے کلام میں تصوف برائے گفتن نہیں بلکہ ان کی زندگی، ان کے داخل، نج اور درون کی عکاسی ہے۔ ان کے ہاں غزلِ مسلسل میں بھی یہی کیفیت ملے گی جو یقیناً قابل قدر ہے۔

مژگان تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایہء قدّ کشیدہ ہوں
ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

ناسخ دبستانِ لکھنو کے نمائندہ سخنور ہیں۔ ناسخ کو قدرت کلام کے باعث پہلوان سخن یوں ہی نہیں کہا جاتا۔ ان کی غزلیں قدرتِ کلام، زبان و بیان اور فن پر گرفت کے باعث دبستانِ لکھنو کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے ہاں غزلِ مسلسل کا بھی یہی حال ہے۔

جی میں ہے خارِ بیاباں جائے اختر دیکھیے
زلفِ جاناں کے عوض شامِ غریباں دیکھیے
کھائیے کیوں داغ معشوقانِ گل رخسار پر
مدعا ہے دیکھنے سے بس گلستاں دیکھیے
چل کے چیتوں کی کمر میں کیجیے طوق اپنے ہاتھ
نرگسِ جادو کی جا چشمِ غزالاں دیکھیے

آتش بھی لکھنو کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ نزاکت اور نفاست ان کے کلام کی بڑی خوبیاں ہیں۔ آتش نے غزلِ مسلسل میں اپنے معیار کو برقرار رکھا ہے۔ آتش کی ایک غزلِ مسلسل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا
رخِ بے داغ دکھلایا تو ہوتا
گلِ لالہ کو شرمایا تو ہوتا
چلے گا کبک کیا رفتار تیری
یہ اندازِ قدم پایا تو ہوتا

ناسخ اور آتش کے دہلوی ہم عصروں میں غالب کا نام سب سے زیادہ پر وقار ہے۔ غالب کے کلام کی تاب و توانائی نے اردو شاعری کو جو وزن و وقار عطاء کیا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ غالب کی غزل ان کے دور ہی میں نہیں آج بھی اپنی معنویت اور اہمیت رکھتی ہے بلکہ آئندہ بھی اس کی وقعت برقرار رہے گی۔ غالب کی غزلِ مسلسل میں موضوع کے تمام رنگ و رخ کو ابھارنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ء ابر آب تھا

شعلہ ء جوالہ ہر یک حلقہ ء گرداب تھا

جلوہ ء گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں ، وہ فرقِ ناز، محوِ بالش کم خواب تھا

بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی حیثیت سے خواہ کیسے ہی رہے ہوں شاعری میں ان کی بادشاہت مسلم ہے۔ ان کا اپنا انداز اور اسلوب بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔

کیا وصف جبیں میں کہوں اس ماہِ جبیں کا

اک تختہ سراسر ہے وہ فردوسِ بریں کا

یا صبح ہے یا آئینہ یا ہے یدِ بیضا

یا صفحہ ء رخسار کسی شوخ جبیں کا

یا مشتری و زہرہ و یا مہرِ درخشاں

یا جلوہ ء پُر نور ہے وہ ماہِ مبیں کا

حکیم محمد مومن خاں مومن اردو غزل کا بڑا شوخ و شنگ نام ہے۔ مومن نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کی جو کیفیات بیان کی ہیں اس کی مثال اوروں کے ہاں کم ہی ملے گی۔ بعض مسلسل غزلوں میں بھی انھوں نے اسی رویے سے نکھار پیدا کیا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں

وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہی حال نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہے جن کو غالب اور حالی جیسے باکمالوں کی صحبت حاصل رہی۔ شیفتہ نے اپنی غزلوں میں عام طور پر جس عنائیت اور حسن و عشق کی کیفیات سے کام لیا ہے وہ ان کی مسلسل غزلوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

پھر محرک ستم شعاری ہے

پھر انھیں جستجو ہماری ہے

پھر وہی داغ و دل سے صحبت گرم

پھر وہی چشم و شعلہ باری ہے

پھر وہی جوشِ نالہ و فریاد

پھر وہی شورِ آہ و زاری ہے

دبستانِ لکھنو اپنی جن خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہے انشاء کی شاعری ان ساری خصوصیات کی حامل ہے۔ ان کی غزلِ مسلسل میں حسن و عشق کے روایتی موضوعات ملتے ہیں۔

دیکھنا جب مجھے کر شان یہ گالی دینا

کس سے تم سیکھے ہو ہر آن یہ گالی دینا

اختلاط آپ سے اور مجھ سے کہاں کا ایسا

واہ جی جان نہ پہچان یہ گالی دینا

اب تو ناداں ہو سنا چاہو سو پیاری کہہ لو

پر تمھیں دیوے گا نقصان یہ گالی دینا

۱۸۵۷ء کے بعد کی غزل کی تاریخ میں حالی کا تذکرہ بہر کیف سب سے پہلے ناگزیر ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ

حالی نے غزل کی مخالفت کی جب کہ یہ کہنا چاہیے کہ حالی غزلوں کی اصلاح چاہتے تھے۔ پھر بھی یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حالی نے جن خصوصیات کی وجہ سے غزل کو نشانہ بنایا وہ خصوصیات خود ان کی غزل میں پائی جاتی ہیں اور غزلِ مسلسل میں بھی۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

امیر مینائی بھی اساتذہ، سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے غزل کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے ہاں جو غزلیات مسلسل ملتی ہیں وہ ان کے معیار اور مرتبہ کی غماز ہیں۔ امیر مینائی کی غزلِ مسلسل ان کے نجی واردات کا مرقع ہے۔

سو دل فدائے صاحبِ فرمانِ رامپور
ہے رام پور جسم وہ ہے جانِ رامپور
بالا ہے قاف سے بھی کہیں شانِ رامپور
زلفِ پری ہے سایہ ء ایوانِ رامپور
غازہ بنائیں لے کے جو پائیں بتانِ چین
رنگِ شکستہ ء چمنستانِ رامپور

داغ کا نام اردو کی دنیائے غزل میں یوں سرِ فہرست ہو گا کہ انھوں نے حالی کی اصلاح کی وجہ سے غزل پر جو ضرب پڑ رہی تھی اس کا دفاع کیا اور زبان، بیان اور فن کی وجہ سے اردو غزل کی آبرو میں بے اندازہ اضافہ

کردیا۔ داغ کے موضوعات خواہ کچھ ہوں لیکن زبان کی وجہ سے وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ غزلِ مسلسل میں ان کے مزاج کی شوخیاں اور محبوب سے چھیڑ چھاڑ کی کیفیات برابر ملتی ہیں۔

مرے جاتے ہیں تیری بے وفائی دیکھنے والے
چراغِ صبح ہیں شامِ جدائی دیکھنے والے
ہمیں ٹھہرے ترے اک اک برائی دیکھنے والے
رکھائی ، بے وفائی ، کج ادائی دیکھنے والے
رہے حیرت میں تیری آشنائی دیکھنے والے
برائی دیکھنے والے ، بھلائی دیکھنے والے

بیسویں صدی کے دوران ہندستان ہی پر نہیں ، ہماری زبانوں پر بھی بہت کچھ گزر گئی۔ اردو شاعری میں اس صدی کا باوقار نام اقبال ہے۔ اقبال نے غزل کو نیا رنگ دیا، اپنے فلسفہ اور فکر کا آئینہ دار بنایا اور نئے رنگ رخ کی غزلیں کہیں۔ ان کی بعض غزلیں تو ایسی ہیں کہ اگر انھیں کوئی ایک عنوان دے دیا جائے تو نظمیں محسوس ہوں۔ یہاں ان کی ایسی ہی مسلسل غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم ، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جو یائے راہ فقر ہے دانائے راہ

علی حیدر طباطبائی اگرچہ نظم تخلص کرتے ہیں لیکن ان کی غزلیں بھی متاثر کن ہیں۔ لکھنو کے بارے میں ان کی ایک غزل مسلسل پڑھیے اندازہ ہو گا۔

مجھ کو سمجھو یادِ رفتگانِ لکھنو

ہوں قدِ آدم غبار کاروانِ لکھنو

خونِ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنو

رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنو

گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے

بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنو

عزیز لکھنوی کا شمار لکھنو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ عزیز نے لکھنو سے اپنے تعلق کے باوجود لکھنوی روایات سے تھوڑا بہت انحراف کرتے ہوئے اپنا طرز پیدا کیا۔ عزیز کی مسلسل غزلوں میں بھی یہ کیفیات مل جاتی ہیں۔ان کے مجموعہ، غزلیات "انجم کدہ" میں ایسی غزلیں موجود ہیں۔

دل کشتہ ، نظر ہے ، محرومِ گفتگو ہوں

سمجھو مرے اشارے ، میں سرمہ در گلو ہوں

مدت سے کھو گیا ہوں ، سرگرمِ جستجو ہوں

اپنا ہی مدعا ہوں ، اپنی ہی آرزو ہوں

صورت سوال ہوں میں ، پوچھو نہ میرا مطلب

میں اپنے مدّعا کی ، تصویر ہو بہ ہو ہوں

چاہے جوش ملیح آبادی نے غزل کی مخالفت کی ہو لیکن یہ جوش ہی ہیں جنھوں نے نہ صرف غزلیں کہیں بلکہ کئی ایک مشاعروں کے لیے طرحی غزلیں بھی لکھیں۔ان کے مجموعے "شعلہ و شبنم" میں جدید رنگِ تغزل اور قدیم رنگِ تغزل کے زیرِ عنوان کئی غزلیں ہیں، یہ جوش کی غزل سے جذباتی وابستگی پر صاد کرتی ہیں۔ جوش کی ایک غزلِ مسلسل کے چند اشعار دیکھیے:

صبر کر اے دل کہ پھر وہ شاہِ خوباں آئے گا

پھر ترے پہلو میں یارِ فتنہ ساماں آئے گا

یوں نہ آہیں بھر کہ پھر اس خلوتِ خاموش میں

اک نہ اک دن یار رقصاں و غزل خواں آئے گا

جان ، اے ناعاقبت اندیش ! رو رو کر نہ دے

کیا کرے گا پیش جب وہ مالکِ جاں آئے گا

اختر شیرانی اردو شاعری میں انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کبھی سلمیٰ، کبھی عذرا و ریحانہ اور کبھی کسی اور کو مخاطب کرتے ہوئے نظمیں کہی ہوں لیکن ان کی غزلوں اور مسلسل غزلوں میں دلکشی اور دیدہ زیبی عیاں ہے۔

جھوم کر آئی ہے مستانہ گھٹا برسات کی

جی لبھاتی ہے نسیمِ جاں فزا برسات کی

باغ کا ایک اک شجر ہے اک عروسِ سبز پوش

جس کو آ کر گدگداتی ہے ہوا برسات کی

رحمتِ حق ، ابر بن کر چار جانب چھا گئی

کب سے کرتے تھے دعائیں مہ لقا برسات کی

فانی تو غزل گو شاعر ہیں ہی۔ ان کی زندگی اتنی محرومیوں کا شکار تو نہیں رہی لیکن ان کے مزاج کی یاسیت ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ فانی کی مسلسل غزلوں میں یہی رنگ ملتا ہے۔

اے زمینِ لکھنو اے آسمانِ لکھنو

تم سے رخصت ہو رہا ہے میہمانِ لکھنو

گرچہ یہ آوارہ ، ملک و وطن کچھ بھی نہیں

تھا مگر منجملہ ، دلدادگانِ لکھنو

گرچہ اس ناخواندہ مہماں کی نہ تھی خاطر عزیز
بے تکلف تھا یہ خاکِ آستانِ لکھنو

حسرت بھی اپنی طرز کے شاعر ہیں۔ اپنی سیاسی اور صحافتی ذمہ داریوں کے باوجود انھوں نے شعر گوئی پر بھی توجہ دی اور بڑی خوبصورت غزلیں کہیں۔ ان کے ہاں کئی مسلسل غزلیات ملتی ہیں جن سے ان کے شعری رنگ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
باربار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

درد کے بعد ہمارے ہاں اگر کوئی واقعی صوفی شاعر گزرا ہے تو وہ اصغر ہیں۔ اصغر نے شاعری کم کی اور تصوف سے زیادہ کام لیا۔ اصغر کا تقریباً سارا شعری سرمایہ غزل پر مشتمل ہے جس میں تصوف کے رنگوں نے قوسِ قزح کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ان کے ہاں مسلسل غزلوں میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
ہم اس کو دیں اسی کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں
مگر خود عشق کو اس سے بھی بے پروا سمجھتے ہیں
کبھی ہیں محوِ دید ایسے سمجھ باقی نہیں رہتی
کبھی دیدار سے محروم ہیں اتنا سمجھتے ہیں

جگر کو امام المتغزلین کہا گیا ہے۔ جگر نے اگرچہ تھوڑی بہت نظم نگاری بھی کی لیکن وہ غزل اور صرف غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں اور اسی سرشاری کے ساتھ جو ان کی غزل کا عمومی رنگ ہے۔

ملا کے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے
تجھے قسم، جو مجھے پاک باز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کرچکوں تجھ پر
یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے
ترے ہی شیوہ ء عاشق کشی کی تجھ کو قسم
اسی طرح مژہ ہائے دراز رہنے دے

ساغر نظامی ہر چند کہ نظم کے شاعر ہیں اور خاص طور پر قومی موضوعات اور شخصیات پر ان کی نظمیں جب الوطنی کے جذبات کو بڑھاوا دینے میں اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان کی غزلیں بھی اپنے رنگ و آہنگ کے سبب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ غزلِ مسلسل بھی۔

غنچے اداس، لالہ و ریحاں اداس ہے
وہ روحِ گل نہیں تو گلستاں اداس ہے
چہرے اتر گئے ہیں گلابوں کے باغ میں
مالی جو اٹھ گیا ہے گلستاں اداس ہے
ہر چند روشنی ہے چراغوں میں کچھ مگر
اس کے بغیر بزمِ چراغاں اداس ہے

ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو مختلف شعبوں میں بہت مالا مال کیا ہے۔ اس کا اعتراف ہر کہہ و مہہ نے کیا ہے۔ ترقی پسندوں نے غزل کی مخالفت ضرور کی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود ممتاز ترقی پسند

شاعروں نے غزلیں کہیں اور شاندار غزلیں کہیں۔ مجروح ترقی پسندوں میں اپنی غزل گوئی کے لیے ممتاز ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ کم سہی لیکن منتخبہ ہے۔ ان کے ہاں مسلسل غزلیں بھی کچھ زیادہ نہیں ملتیں، بس ایک آدھ۔ راقم الحروف نے بھی ایک غزل کا تجزیہ کیا ہے۔ مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک کا ایک اہم نام ہے۔ مخدوم نے اپنی شعری زندگی میں غزل کی طرف بہت بعد میں توجہ دی اسی لیے ان کے ہاں غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں صرف چھبیس ہے۔ ایک دو غزلِ مسلسل بھی مل جاتی ہیں جن میں "محبت اور محنت" کا رنگ نمایاں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی، رات پھولوں کی
آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک میں اپنی نظم نگاری کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔۔ انھوں نے غزلیں کم کہی ہیں لیکن غزل کے رنگ ان کے ہاں بھرپور ملتے ہیں۔ مسلسل غزلیں بھی ان کے ہاں کچھ زیادہ نہیں۔

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں، وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ
پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ
حوصلہ ہو تو اُڑو میرے تصوّر کی طرح
میری تخئیل کے گل زارِ جناں تک آؤ

اردو کی جدید شاعری میں شہریار کا مقام اونچا ہے۔ ترقی پسندی سے تھوڑے بہت لگاؤ کے باوجود شہریار ترقی پسندوں سے دور رہے، اسی طرح جدیدیت سے قریب رہنے کے باوجود جدیدیت سے دور۔ جدید شاعروں میں ان کی غزلیں اپنا انفرادی رنگ رکھتی ہیں حالاں کہ وہ غزل مزاج ہیں لیکن غزل مسلسل ان کے پاس زیادہ نہیں۔ شہریار کی ایک غزل مسلسل کے چند شعر دیکھیے۔

شبِ غم کیا کریں کیسے گزاریں
کسے آواز دیں، کس کو پکاریں
سرِ بام تمنّا کچھ نہیں ہے
کسے آنکھوں سے اس دل میں اتاریں
وہی مبہم سی سرگوشی ہوا کی
وہی افسردہ شمعوں کی قطاریں

پروفیسر مغنی تبسم نے شاعری پر توجہ ابتداء سے کی لیکن کم کم۔ ان کا شعری سرمایہ ہی کم نہیں بعض غزلیں تو بس تین تین، چار چار اشعار پر مشتمل ہیں۔ تاہم غزلِ مسلسل تلاش کرنے میں ان کے ہاں مایوسی نہیں ہوتی۔

منزلیں اس کی مرادوں کا نگر اس کا ہے
پاؤں میرے ہیں تقاضائے سفر اس کا ہے
لوح اس کی ہے، قلم اس کا، مقدر میرا
ہاتھ میرے ہیں دعاؤں میں اثر اس کا ہے
اس کی راتیں مرے خوابوں کو جنم دیتی ہیں
جاگتی آنکھوں سے پیمانِ سحر اس کا ہے

عصر حاضر میں بعض ایسے شعرا بھی ملتے ہیں جنھوں نے کسی تحریک یا نظریہ سے اپنی خصوصی وابستگی

قائم نہیں کی۔ انھوں نے اپنی مرضی سے کہا اور اپنے انداز سے۔ ایسے شاعروں میں سب سے پہلے راقم الحروف نے سکندر علی وجد کے ہاں غزلِ مسلسل کی تلاش کی۔ وجد کی شاعری کی زبان سیدھی سادی، سہل اور آسان ہے۔ ان کی غزلِ مسلسل بھی ایسی ہی ہے۔

کیا بتاؤں تجھے میں کیا ہے تو
میرے جینے کا آسرا ہے تو
میں کہاں منّتِ طبیب کہاں
میرے ہر درد کی دوا ہے تو
میں تو سایہ نہیں ہوں کچھ تیرا
اپنے سائے سے کیوں خفا ہے تو

میکش حیدر آبادی کی جواں مرگی نے اردو کے ایک اچھے شاعر کو ہم سے چھین لیا۔ میکش کے پاس زندگی کی تلخیوں اور تلخ کامیوں کا رونا نہیں۔ وہ اپنے من کے موجی رہے اور غزل کو لغوی معنوں میں استعمال کیا۔ ان کی غزلِ مسلسل میں بھی ایسے ہی مضامین کی ترسیل ہوتی ہے۔

شرابِ ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا
پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
کہیں نگاہ کی مستی بھی حل نہ ہو جائے
کہ جامِ مے کی طرف سے نظر ہٹا کے پلا
جھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرِ مے میں
پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا

ناصر کاظمی کا نام بیسویں صدی عیسوی کے شاعروں میں خاصا نمایاں ہے۔ ناصر کی غزل غمِ عشق اور غمِ زندگی دونوں سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات کا سیدھے سادے اور پر اثر انداز میں

اظہار کیا ہے۔ ایسی سہل اور آسان زبان اور اتنی تاثیر بہت کم شاعروں کی غزلوں میں ملتی ہے۔ ناصر کی مسلسل غزلیں بھی اسی رنگ ڈھنگ کی ہیں۔

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے
دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے
پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتلِ گل عام ہوا ہے اب کے

وحید اختر کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم مزاج ہیں، اسی لیے ان کی شاعری دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ وحید اختر نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان پر نظم کا اسلوب چھایا ہوا ہے۔ ان کے ہاں مسلسل غزلوں میں بھی یہی کیفیت ملے گی۔

اک غزل آج بہ اندازِ قصیدہ لکھیے
ظلم اور کذب کے اوصافِ حمیدہ لکھیے
کیجیے ان کی ثنا جتنے ہیں قشقہ بہ جبیں
جتنے ہیں اہلِ ریا، سب کا قصیدہ لکھیے
مصلحت ہے یہی مقتول کو ظالم کہیے
قاتلوں کو ستم و درد گزیدہ لکھیے

شاذ تمکنت کی بات کچھ اور ہے۔ شاذ کی شاعری دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتی ہے۔ حلاوت، تغزل، سرشاری اور شیرینی سے ان کی غزلیں مملو ہیں۔ تلمیحات، استعارات اور دلکش لفظوں کے استعمال میں شاذ کو بہت زیادہ مہارت حاصل ہے۔ ان کی غزلِ مسلسل میں یہی مٹھاس، اپنائیت اور لگاؤ ملے گا۔

کوئی گلہ ، کوئی شکوہ ذرا رہے تم سے
یہ آرزو ہے کہ اک سلسلہ رہے تم سے
اب ایک دن کی جدائی بھی سہہ نہیں سکتے
جدا رہے ہیں تو برسوں جدا رہے تم سے
فقط یہ بات کہ تم سے بڑی امیدیں ہیں
خفا نہ ہونا اگر ہم خفا رہے تم سے

سعید شہیدی تو غزل ہی کے شاعر ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں ان کی غزلیں اچھی لگتی ہیں ان کی ایک غزلِ مسلسل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

متاعِ بے خودی ہے آپ کا غم
شعورِ بندگی ہے آپ کا غم
میں خود کو کیسے سمجھوں بے سہارا
خدا رکھے ابھی ہے آپ کا غم
کلیجے سے لگا رکھا ہے اس کو
قرارِ واقعی ہے آپ کا غم

شاعرات میں بانو طاہرہ سعید کا نام نمایاں ہے۔ ان کی غزلِ مسلسل بھی دیکھیے۔

بچھڑ کر تجھ سے پلکوں میں نمی ہے
بھری دنیا میں کیوں تیری کمی ہے
تو ہی اک میرا سچا قدر داں تھا
تجھ ہی سے شخصیت میری بنی ہے
ترے فیضِ نظر کا تھا کرشمہ

مجھے لوگوں میں جو شہرت ملی ہے

رحمٰن جامی کا کلاسیکل شاعری کا مطالعہ مواد اور زبان و بیان پر قدرت بے مثال ہے۔ انھوں نے غزلیں بہت اچھی کہی ہیں۔ ان کی مسلسل غزلیں بھی قاری کے دل میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔

اس دور میں لاج شریفوں کی سچ یہ ہے ذرا محفوظ نہیں
کیا نکلیں گھر سے باہر ہم دستار و قبا محفوظ نہیں
ہر روز توازن بگڑا ہے ہر روز نیا اک جھگڑا ہے
جو آب و ہوا تھی جینے کی وہ آب وہوا محفوظ نہیں
دل میں تو تعصب ہے ان کے باہر سے جتاتے ہیں چاہت
ہے ساری سیاست ووٹوں کی وعدوں کی ادا محفوظ نہیں

مضطر مجاز نے بھی کلاسیکل شعر و ادب کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔ فارسی شعر و ادب سے دلچسپی نے ان کی شاعری کو امتیاز بخشا ہے۔ ان کی غزلِ مسلسل میں فکری ارتقاء نظر آتا ہے۔

اگ رہی ہیں ، قحط غزلوں کا نہیں
بھُک مری کا کوئی اندیشہ نہیں!
چل رہے ہیں کارخانے شعر کے
کون سا ہے مال جو گلتا نہیں
وزن بھی ہے، قافیہ بھی ، بحر بھی
شعر کہتے ہیں جسے ملتا نہیں

جعفر رضا ان شاعروں کی نمائندگی کرتے ہیں جنھوں نے ایک عرصہ تک یا تو کہا نہیں یا کہا ہے تو چھپایا نہیں۔ جعفر رضا کی شاعری کا مجموعہ "برف کی آگ" قابلِ مطالعہ ہے۔ ان کے ہاں غزلِ مسلسل بھی ملتی ہے۔

وہ ، اک سحاب تھا ، سایہ کیے رہا مجھ پر
وہ ، ابرِ نیساں تھا ، اکثر برس گیا مجھ پر
وہ ، جب خفا ہوا ، نرمی کے ساتھ کہتا تھا
تو ، عادتوں میں بڑی حد تلک گیا مجھ پر
چلا گیا وہ ، ہواؤں کے دوش پر تنہا
مثالِ صبح ، کرن سی ، بکھیرتا مجھ پر

علیم صبا نویدی زود گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنا ایک معیار رکھا۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ کریں تو چند ایک مسلسل غزلیں مل ہی جاتی ہیں۔

میں آفتابِ صبحِ تمنّا کا فرد ہوں
جو آسماں کے شہر سے نکلا وہ مرد ہوں
احساس میرا شعلہ ء دوزخ کا ہم مزاج
مانا میں گفتگو کے جزیرے میں سرد ہوں
میری شناخت کون کرے گا کہ اب بھی میں
اجڑے ہوئے دیار کی نادیدہ گرد ہوں

اردو میں غزلِ مسلسل کا یہ جائزہ ظاہر ہے اپنی کچھ حدود رکھتا ہے۔ اگر ہر دور کے تمام شاعروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے ہاں غزلِ مسلسل کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو اس صورت میں مختصر تجزیہ بھی اس قدر ہو جاتا کہ ایسے کئی مقالے ناکافی ہوتے۔ راقم الحروف کی سعی یہی رہی ہے کہ دبستانِ دکن سے لے کر تاحال اردو شاعری کے ادوار اور دبستانوں کے منتخبہ شاعروں میں سے بھی چند ایک کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے موضوع کی روشنی میں ان کے ہاں غزلِ مسلسل کی تشخیص و تحسین کروں اور ان کا فکری و فنّی جائزہ لوں۔ ظاہر ہے اس سفر

میں بعض اہم شاعر چھوٹ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بعض شاعروں کی مسلسل غزلیں بھی میری نظر سے نہ گزری ہوں لیکن مجھے اطمینان یہ ہے کہ میں نے اردو شاعری کے ہر دور، ہر علاقے اور ہر رنگ کے چند ایک ہی سہی نمائندہ شاعروں کی مسلسل غزلوں کا جائزہ لیا ہے تاکہ مجموعی طور پر اردو شاعری میں غزلِ مسلسل کی ممکنہ حد تک ہی سہی ایک تصویر پیش کی جاسکے۔

تحقیق میں کوئی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ مجھے امید ہے کہ غزلِ مسلسل پر کام کرنے والے مستقبل کے محقق کے لیے میری یہ طالب علمانہ کوشش نشانِ منزل کا کام انجام دے گی۔

○●○

کتابیات

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	ناشر	سنہ اشاعت
۱	اختر انصاری	غزل اور غزل کی تعلیم	نئی دہلی	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۹ء
۲	ابوالنصر محمد خالدی	کلامِ معظم بیجاپوری	---	---	۱۹۸۰ء
۳	احسن مارہروی	کلیاتِ ولی	اورنگ آباد	انجمن اردو پریس	۱۹۲۷ء
۴	الطاف حسین حالی	دیوان حالی	---	---	---
۵	الطاف حسین حالی	مقدمۂ شعرو شاعری	---	---	---
۶	اختر شیرانی	کلیاتِ اختر شیرانی	نئی دہلی	نیو تاج آفس	---
۷	آتش	کلیاتِ آتش	کانپور	منشی نول کشور	---
۸	اصغر حسین اصغر	سرودِ زندگی	لاہور	تاج کمپنی لمیٹیڈ	۱۹۳۳ء
۹	اطہر پرویز	ادب کا مطالعہ	علی گڑھ	اردو گھر	۱۹۸۶ء
۱۰	آل احمد سرور	تنقید کیا ہے	دہلی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۶۴ء
۱۱	آل احمد سرور	ادب اور نظریہ	لکھنو	---	۱۹۵۴ء
۱۲	ابواللیث صدیقی	لکھنو کا دبستانِ شاعری	علی گڑھ	---	---
۱۳	جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو	نئی دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز	۱۹۷۷ء جلد اول
۱۴	جمیل جالبی	دیوان حسن شوقی	پاکستان	انجمن ترقی اردو	۱۹۷۱ء
۱۵	جگر مراد آبادی	کلیاتِ جگر	حیدرآباد	جگر اکیڈیمی	---
۱۶	جوش ملیح آبادی	شعلہ و شبنم	---	ہمالیہ بک ہاوس	۱۹۸۰ء
۱۷	جعفر رضا	برف کی آگ	الہ آباد	جعفر رضا	۲۰۰۲ء
۱۸	حفیظ قتیل	دیوانِ ہاشمی	حیدرآباد	ادارہ ادبیات اردو	۱۹۶۱ء

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	ناشر	سنہ اشاعت
۱۹	حمید اورنگ آبادی (مترجم ایم کے فاطمی)	گلشنِ گفتار	---	---	---
۲۰	حاجی محمد اسحاق خاں	کلیاتِ شیفتہ و حسرتی	بلند شہر	---	۱۹۱۶ء
۲۱	حسرت موہانی (مرتب)	انتخابِ سخن	---	---	--- جلد یازدہم
۲۲	حسرت	دیوانِ حسرت	لکھنو	رسالہ تمدن لکھنو	۱۹۱۶ء
۲۳	خالدہ بیگم	دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	حیدرآباد	---	۱۹۵۸ء
۲۴	خلیق انجم (مرتب)	جوش ملی آبادی: تنقیدی جائزہ	نئی دہلی	انجمن ترقی اردو (ہند)	۱۹۹۲ء
۲۵	رحمٰن جامی	میکدہ	حیدرآباد	ادارہ اقلیم ادب	۲۰۰۳ء
۲۶	زینت ساجدہ	کلیاتِ شاہی	حیدرآباد	---	۱۹۶۲ء
۲۷	سید احتشام حسین	اعتبارِ نظر	---	---	---
۲۸	سید احتشام حسین	اردو کی کہانی	نئی دہلی	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۰ء
۲۹	سیدہ جعفر (مرتب)	کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ	نئی دہلی	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۵ء
۳۰	سید محمد (مرتب)	دیوانِ عبداللہ قطب شاہ	---	مجلس اشاعت دکنی مخطوطات اور دکن ساہتیہ پرکاش سمتی	۱۹۵۹ء
۳۱	سید محمد صدر الدین	انتخاب کلامِ درد	پٹنہ	پستک بھنڈار	---
۳۲	سید علی احسن ماہروری	یادگارِ غالب	لاہور	---	---
۳۳	سلیمان اطہر جاوید	تنقیدِ شعر	حیدرآباد	---	۱۹۸۱ء
۳۴	سید صفی مرتضیٰ	اصنافِ ادب کا ارتقا	لکھنو	نسیم بک ڈپو	۱۹۸۶ء

سنہ اشاعت	ناشر	مقام اشاعت	کتاب	مصنف	سلسلہ نشان
۱۹۷۵ء	---	دہلی	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	سید اعجاز حسین	۳۵
۲۰۰۳ء، جلد اول تا چہارم	سیدہ جعفر	حیدرآباد	تاریخ ادب اردو عہدِ میر سے ترقی پسند تحریک تک	سیدہ جعفر	۳۶
۱۹۵۷ء	انجمن ترقی اردو	علی گڑھ	وجد	سکندر علی وجد	۳۷
۱۹۹۳ء	سعید شہیدی	---	کفِ گل فروش	سعید شہیدی	۳۸
۱۳۴۲ھ	شیخ جان محمد الہٰ بخش	لاہور	گل دستۂ حضرت محسن کاکوروی	شیخ الہ بخش گنائی لاہوری	۳۹
۱۹۲۸ء	----	---	چمنستانِ شعراء	شفیق لالہ لچھمی نارائن	۴۰
۲۰۰۱ء	---	---	حاصلِ سیرِ جہاں	شہریار	۴۱
۱۹۷۷ء	نژاد کتاب گھر	حیدرآباد	نیم خواب	شاذ تمکنت	۴۲
۱۹۳۴ء	مطبع شانتی پریس	الہ آباد	دیوانِ مومن	ضیا احمد ضیا	۴۳
۱۹۵۷ء	حالی پبلشنگ ہاوس	نئی دہلی	انتخاب کلامِ ظفر	ظفر	۴۴
۱۹۵۵ء	انجمن ترقیِ اردو (پاکستان)	پاکستان	غزل اور مطالعہ غزل	عبادت بریلوی	۴۵
۱۳۵۷ھ	سلسلۂ یوسفیہ	حیدرآباد	کلیاتِ سراج	عبدالقادر سروری	۴۶
1959	انجمن ترقی اردو (ہند)	نئی دہلی	انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۴۷
۱۹۸۶ء	مکتبۂ جامعہ	---	ایک اور خواب	علی سردار جعفری	۴۸
۱۹۷۷ء	ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشن	مدراس	لمسِ اول	علیم صبا نویدی	۴۹
۱۹۸۱ء	ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشن	مدراس	فکر بر	علیم صبا نویدی	۵۰

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	ناشر	سنہ اشاعت
۵۱	علیم صبا نویدی	اثر خامہ	مدراس	ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشن	۱۹۹۱ء
۵۲	علیم صبا نویدی	طرح نو	مدراس	ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشن	۱۹۷۵ء
۵۳	عزیز قیسی (مرتب)	دو آتشہ	حیدرآباد	اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش	---
۵۴	غالب	دیوانِ غالب (نازایڈیشن)	نئی دہلی	ناز پبلشنگ ہاؤس	---
۵۵	کمال احمد صدیقی	آہنگ اور عروض	نئی دہلی	ترقی اردو بورڈ	۱۹۸۹ء
۵۶	مسعود حسین خاں	محمد قلی قطب شاہ	دہلی	----	۱۹۹۸ء
۵۷	محمد علی اثر	دکنی غزل کی نشو و نما	حیدرآباد	الیاس ٹریڈرس	۱۹۸۶ء
۵۸	مسعود حسین خاں	اردو غزل کے نشتر	نئی دہلی	غالب اکیڈیمی	۱۹۹۵ء
۵۹	محمد بن عمر	کلیاتِ غواصی	حیدرآباد	اِدارۂ ادبیات اردو	۱۹۵۹ء
۶۰	محمد انوار الحق	دیوانِ غالب جدید	---	---	---
۶۱	محمد عبدالمجید	دیوانِ ظفر	کانپور	مطبع مجیدی	---
۶۲	محمود احمد انور مینائی (مرتب)	صنم خانۂ عشق	حیدرآباد	امیر المطابع	---
۶۳	محمد اقبال	بالِ جبرئیل	دہلی	اردو پاکٹ بک سیریز	۱۹۶۳ء
۶۴	مکتبہ ابراہیمیہ	دیوانِ حیدر طباطبائی	حیدرآباد	انجمن امداد باہمی	۱۹۳۳ء
۶۵	میر تقی میر	کلیاتِ میر تقی میر	---	---	---
۶۶	مظفر حنفی	کلیاتِ ساغر نظامی	نئی دہلی	ماڈرن پرنٹنگ	۱۹۹۸ء
۶۷	مجروح سلطان پوری	غزل	ممبئی	قلمکار بک سیلرس پبلشرس	۱۹۵۹

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	ناشر	سنہ اشاعت
۶۸	مخدوم محی الدین	بساطِ رقص	حیدرآباد	اردو اکیڈمی آندھرا پردیش	۱۹۸۶ء
۶۹	مغنی تبسم	درد کے خیمے کے آس پاس	حیدرآباد	مکتبۂ شعر و حکمت	۲۰۰۲ء
۷۰	مضطر مجاز	اک سخن اور	حیدرآباد	مکتبۂ شعر و حکمت	۱۹۹۸ء
۷۱	ناسخ	کلیاتِ ناسخ	---	---	---
۷۲	ناصر کاظمی	دیوانِ ناصر کاظمی	حیدرآباد	حسامی بک ڈپو	---
۷۳	نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	نئی دہلی	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۵ء
۷۴	نورالحسن ہاشمی	دلی کا دبستانِ شاعری	دہلی	---	۱۹۵۸ء
۷۵	وحید اختر	زنجیر کا نغمہ	علی گڑھ	حسن وحید، زرافشاں	۱۹۸۱ء
۷۶	یوسف حسین خاں	اردو غزل	علی گڑھ	انجمن ترقی اردو	---

رسائل

شعر و حکمت	حیدرآباد
گلبن	احمد آباد
ہماری زبان	نئی دہلی
سب رس	حیدرآباد
قومی زبان	حیدرآباد
آندھرا پردیش	حیدرآباد

شیرازہ	سری نگر کشمیر
شاعر	ممبئی
آج کل	دہلی
نیا دور	لکھنو
شب خون	الہ آباد
کتاب نما	دہلی
فنون	پاکستان
شہرزاد	پاکستان

اخبارات

روز نامہ سیاست	حیدر آباد
روز نامہ منصف	حیدر آباد
روز نامہ رہنمائے دکن	حیدر آباد
روز نامہ ہمارا عوام	حیدر آباد
روز نامہ انقلاب	ممبئی

○●○

Dept. of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad,
H y d e r a b a d - 46

CERTIFICATE

Date: 03-11-2003

This is to certify that, I, **MOHAMMED JAFER,** have carried out the research embodied in the present thesis entitled ***"URDU MEIN GHAZAL-E-MUSALSAL RIWAYAT AUR FUNN"*** for the full period prescribed under Ph.D. ordinance of the University. I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any university.

(Signature of the Candidate)
Name: *MOHAMMED JAFER*
Enrolment No. 95HUPH01

3/11/03
अध्यक्ष/Head
उर्दू विभाग/Department of Urdu
हैदराबाद विश्वविद्यालय
University of Hyderabad
हैदराबाद-500 046
Head, Dept. of Urdu.

Signature of the Supervisor 3.11.2003
रीडर/Reader
उर्दू विभाग/Department of Urdu
हैदराबाद विश्वविद्यालय
University of Hyderabad
हैदराबाद-500 046

6/11/03
DEAN,
School of Humanities.

URDU MEIN GHAZAL-E-MUSALSAL
RIWAYAT AUR FUNN

THESIS

Submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU

2003 A.D.

Submitted
by

MOHAMMED JAFER
M. A., (Osm.), M. Phil., (Hyderabad)

Supervised
by

DR. MIR MAHBOOB HUSSAIN
MLIS (Madras), M.Phil, Poli. Sc., (Osm), Ph.D., in Urdu (Hyderabad)
Reader, Dept. of Urdu, University of Hyderabad.

DEPARTMENT OF URDU,
SCHOOL OF HUMANITIES,
UNIVERSITY OF HYDERABAD,
HYDERABAD-500046 (A.P.) INDIA.